مٹی کے متوالے
گلزار جاوید

گلزار جاوید

ماں کی اس خوشبخت کوکھ کے نام جس سے

مسیحائے انساں

جنم لینے کو ہے

نصیبِ قلم

چھٹ پنے کی باتیں

....

1۔ مٹی کے متوالے

2۔ مس کہکشاں

3۔ شہیانہ مزاجی

4۔ آواگون

5۔ قرضِ حسنہ

6۔ اِچھادھاری ناگ

7۔ ادھ کھائی بوٹیاں

8۔ پھول، خشبواور کتاب

9۔ دلبر صحرائی

10۔ پہلی اِننگ

11۔ نقشِ برآب

12۔ تقدیرِ اُمم

13۔ چارلی

14۔ من مندر

15۔ مسائلِ تصوّف

16۔ میر صاحبنی

17۔ شُمھ چنک
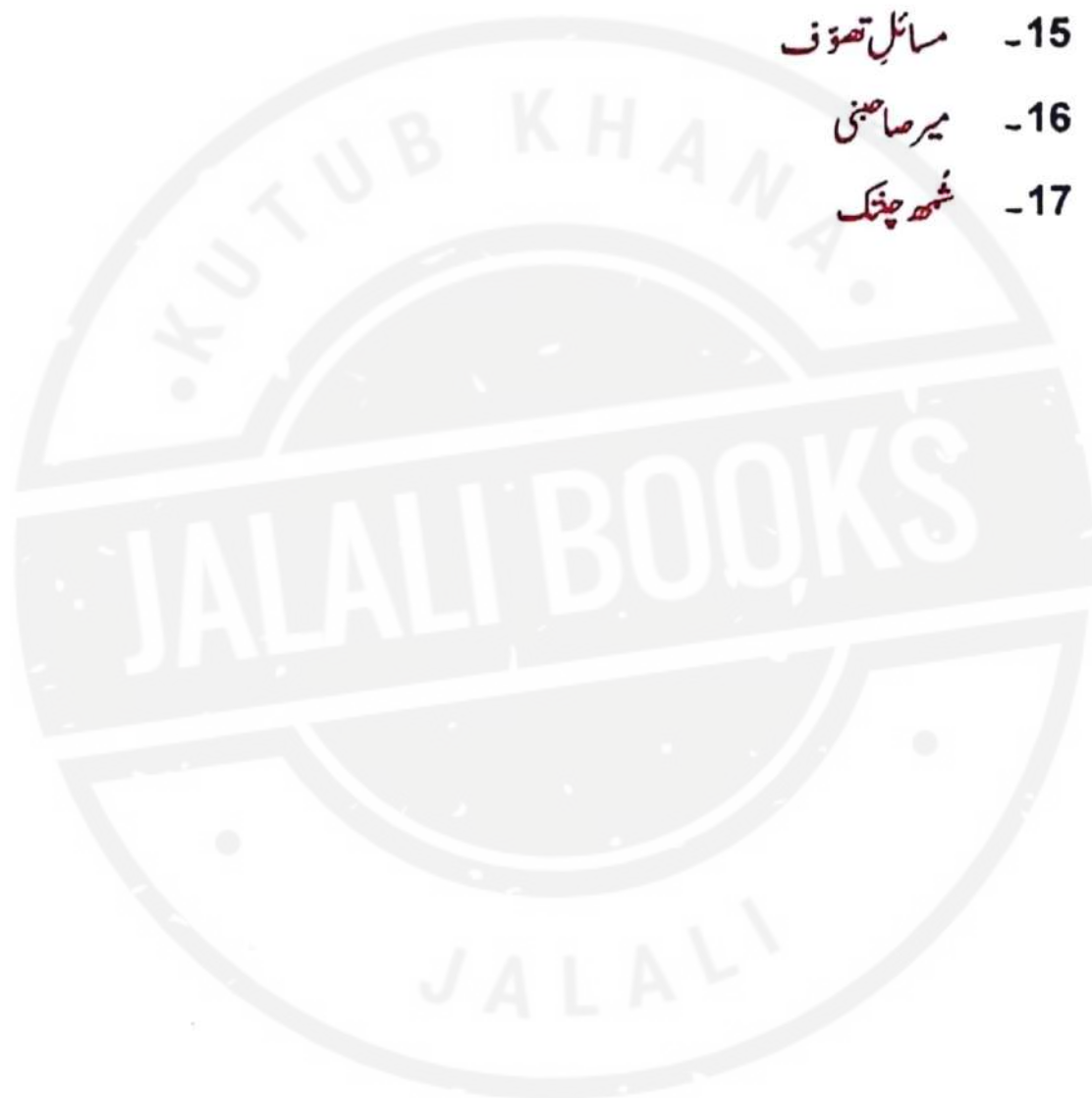
چھٹ پنے کی باتیں!

انسانی احساسات و جذبات کی نسبت تخلیق کیے گئے سبھی الفاظ' برق رفتاری سے' اہمیت و افادیت کھوتے جا رہے ہیں......! جیتے جاگتے' چلتے پھرتے' رفیقوں' رقیبوں' شناسوں' ناشناسوں' کی مانند قرطاس و قلم کی قید میں جکڑے' کرداروں کی روز روز' طعن و تشنیع جی کا عذاب بنتی جا رہی ہے......! ہر کسی کو ہمارے کہے کی چبھن' ہر کوئی ہمارے لکھے کی بے ثباتی پر گلہ مند.....! بے تکلف دوستوں اور باتکلف بزرگانِ قلم کا بیشتر امور پر اختلاف رائے ہونے کے باوجود' راقم الحروف کے کامیاب ادیب نہ بننے پر' کُلّی اتفاق و اطمینان پایا جاتا ہے........! موضوعات کی ہمہ رنگی و ہمہ جہتی کے قائل احباب بھی' ہماری بے باکی بلکہ منہ پھٹی کو ادب اور خود ہمارے حق میں نیک فال نہ گردانتے ہوئے اپنی رائے کو وزن فراہم کر رہے ہیں.........!!

انسان کے سامنے خواہش و حقیقت پر اُستوار' راستے ہمیشہ وا رہے ہیں......! ہمارے لئے بھی ''اردو ادب'' کا روائتی راستہ اس قدر تنگ نہ تھا کہ چند کلاسیکی شہ پاروں کو اپنی اشتہا کی بھینٹ چڑھا کر' شہرت و ناموری سے ہم کلامی کے بعد خود بھی شاد ہوتے اوروں کو بھی شاد کرتے.....! دوسرا راستہ کسی قدر کٹھن اور دشوار گذار ہے جہاں قدم قدم پر گرد و پیش کی بدصورتی اور ناہمواری اپنی بے بسی پر ماتم کناں ہے......! مقصود' ہمارے خیال میں طمانیت حاصل کرنا ہے' الحمدللہ.....!''مٹی کے متوالے'' میں شامل کوئی ایک کہانی بھی تخلیقیت کی معراج کو بے شک چھو کر نہ آئے' گم شدہ انسانیت کی تلاش میں سرگرم و سرگرداں ضرور دکھائی دے گی' یہ بھی ممکن ہے......! بہت سے بزرگانِ

ادب کے خیال میں یہ ''چھٹ پنے کی باتیں'' گردانی جائیں.......! ہمارے لئے اپنی مٹی، اپنے لوگ، اپنے روز و شب سے کٹ کر زندگی کا تصور بڑا ہی کرب ناک ہے......!!!

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی
لکھ دیجیو یا رب اُسے قسمت میں عدو کی

اچھا ہے سر انگشتِ حنائی کا تصور
دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی

غالب

گلزار جاوید

537/D-1 ویسٹریج III راولپنڈی، پاکستان

26 فروری 2004ء

مٹی کے متوالے

آپ نے‘ اس امر پر کبھی غور کیا ہے گھڑی کی ایجاد سے قبل‘ عوام الناس وقت کی رفتار کی بابت اپنا تجسس واشتیاق‘ کس طرح اور کتنے عرصے میں دور کر پاتے ہوں گے؟ میں! آپ کے دور کا آدمی ہوں اور ہر طرح کی جدت پسندی سے مستفید ہو چکا ہوں۔ اس وقت! مجھے اپنی رسٹ واچ کی کمی کا شدت سے احساس ہو رہا ہے۔ بے خیالی میں‘ بار بار دایاں ہاتھ بائیں کلائی پر اور کبھی بایاں دائیں کلائی پر‘ کوئی شے تلاش کرنے لگتا ہے۔ میرے لئے! وقت کا تعین بہت ضروری ہے کیونکہ! اس وقت بجنے والے‘ گھنٹوں‘ منٹوں سے زیادہ مجھے اس مدت کا تعین کرنا ہے جو میری نہ ختم ہونے والی مسافت پر محیط ہے۔ سرِ دست! مجھے اپنی منزل کا علم‘ نہ سفر کا جواز معلوم ہے۔ میں چل رہا ہوں‘ چل رہا ہوں‘ بس چلتا ہی جاتا ہوں۔ میرا جسم تھکن سے چُور اور معدہ غذا سے خالی ہے۔ مسلسل شب بیداری کے باعث‘ ذہن سوچنے اور سمجھنے سے قطعی عاری ہو چکا ہے۔ چاہتا ہوں‘ پل بھر کو ٹھہروں‘ سوچوں اور غور کروں میں کب چلا تھا‘ کہاں سے چلا تھا‘ کس لئے چلا تھا اور کس جانب چلا تھا؟ ہر بار! مقناطیسی قوت‘ مجھے سفر جاری رکھنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ جس کے باعث‘ آسمانوں میں اڑتی پتنگ کی مانند‘ ڈور کھینچنے والے کی جانب کھنچا چلا جا رہا ہوں۔

ہر جانب عجب طرح کی پراسراریت اور سراسیمگی پھیلی ہوئی ہے۔ وقت کا اندازہ ہے نہ مقام کا تعین ہو رہا ہے۔ کبھی‘ ریگ زاروں کی تپش سے میرے پاؤں کی ایڑیاں جھلسنے

لگتی ہیں تو کبھی' برف کی ٹھنڈک سے میرے تلوے ٹھٹھرنے لگتے ہیں اور کبھی کانٹوں کی چبھن سے' مجھے اپنے پنجوں میں شدید تکلیف کا احساس ہوتا ہے۔ امید کی کوئی کرن' آس کی کوئی روشنی اور حوصلے کی کوئی تدبیر نظر نہیں آتی ...... مگر ٹھہریئے ...... ذرا ٹھہریئے! ...... روشنی کا ایک موہوم سا دھبہ دکھائی دے رہا ہے ...... ہوسکتا ہے یہ میرا وہم یا نظر کا دھوکا ہو ...... مجھے کیا کرنا چاہئے؟ ...... یہیں کھڑے ہو کر اس کا انتظار یا اس کی جانب سفر ...... ٹھہرنا! بس میں نہیں' میرے خیال میں سب سے پہلے' مجھے اپنی آنکھوں کو' دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کی مدد سے' اچھی طرح صاف کرنا چاہئے تاکہ صحیح طور پر روشنی کی حقیقت یا سراب کا اندازہ لگایا جا سکے۔

میرا وہم ہے نہ اندازہ غلط ...... روشنی حقیقت بن کر میری جانب بڑھی چلی آ رہی ہے ...... میرے خیال میں! روشنی کے ساتھ' ایک انسانی ہیولیٰ بھی نمایاں ہونا شروع ہو گیا ہے ...... اب تو! لاٹھی یا چھڑی کی ٹھک ٹھک بھی صاف سنائی دینے لگی ہے ...... مجھے کیا کرنا ہوگا ...... اپنے دفاع کی تیاری ...... اجنبی سے مدد کی التجا ...... یا ...... یا ...... یا ...... سنئے ...... سنئے ...... میں نے کہا! ذرا ادھر آیئے ...... نقاہت اور خوف کے باعث میری آواز' کانٹے بن کر حلق کے اندر ہی پھنس رہی تھی ...... ایک مرتبہ اور میں نے پوری قوت اور جوش سے ...... پھر پکارا ...... ذرا سنیئے! مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے ...... متناسب جسم' تھوڑے سے کرلی بال' کسی قدر جھکے شانے' ناتواں سینہ' گول رخسار' ستواں ناک' عقابی آنکھیں اور درمیانہ قد کے حامل شخص نے' میری آواز سن لی تھی۔ ہاتھ کے اشارے سے صبر کی تلقین کرتے ہوئے شخص مذکور نے' میری جانب تیز تیز قدم بڑھانا شروع کر دیئے تھے۔

''کون ہو میاں! ...... کہاں سے آ رہے ہو؟ ...... کہاں کا قصد ہے؟ ......''

''جی میں ...... میرا ...... میں ......''

ایک مرتبہ پھر میں' اپنے حواس پر قابو نہ رکھ سکا۔

''میرا خیال ہے! طویل مسافت کے باعث تھک گئے ہو۔ چلو' میرے ساتھ چلو! کچھ دیر آرام کے ساتھ تھوڑا بہت کھا پی لو' باقی کی باتیں بعد میں کریں گے۔''

نو وارد نے بات ختم کرتے ہوئے چھڑی کے اشارے سے' اپنے پیچھے آنے کی ہدایت کی۔

''یہ کون سی جگہ ہے؟ آپ یہاں کب سے رہتے ہیں؟ آپ کے ساتھ اور کون رہتا ہے یہاں؟ آپ! کام کیا کرتے ہیں؟ ......''

میرے تمام سوالوں کے جواب میں' نو وارد نے صرف اتنا کہا ''تمہارے تمام سوالات بے

وقت اور بلا جواز ہیں۔لہذا خاموشی سے میرے پیچھے چلتے آؤ..........''
اپنے سوال کے خشک اور جذبات سے عاری جواب پر میرے جسم میں چیونٹیاں رینگنے لگی تھیں۔قبل اس کے میں کسی منطقی نتیجے پر پہنچوں'اس نے مجھے چھڑی کی مدد سے رکنے کا اشارہ کیا اور سرخ سرخ' گول مٹول سیبوں کے درخت کے نیچے پڑی منقش پائے والی چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود چارپائی کے سامنے پڑے' جہازی سائز کے چوڑے چکلے شفاف پتھر پر بیٹھتے ہوئے کسی کو بلانے کے لئے ہانک لگائی.........

''ہاں تو میاں! آرام سے پیر اوپر کر کے بیٹھو اور اپنی بابت تفصیل سے بتاؤ کہ ادھر کیسے آنا ہوا..........''

''جی میں..........میں..........''

''ہاں ہاں! شرمانے یا گھبرانے کی کیا ضرورت ہے.....مگر ٹھہرو! (لالٹین میرے چہرے کے قریب کرتے ہوئے).....لگتا ہے میں نے تمہیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے..........؟''

''جی جی! ضرور دیکھا ہوگا آپ نے..........دراصل میں وہ..........''

''ذرا چہرہ تو اوپر اٹھاؤ..........''

(دائیں ہاتھ کی مدد سے' میری ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ اوپر کرتے ہوئے مجھے غور سے دیکھا)

''تم..........رائٹر تو نہیں..........؟''

''جی جی.....بالکل درست پہچانا آپ نے.....دراصل اپنے منہ میاں مٹھو بننے یا اپنی تعریف کرنے سے میں بہت گھبراتا ہوں.....'' (فخر سے سینہ پھلا کر' روایتی انکساری کا رنا رٹتے ہوئے میں نے اپنے مدِ مقابل کو ڈھیر کرنے کی کوشش کی)

''اردو ادب سے تعلق ہے نا تمہارا..........؟''

''جی.....جی.....صحیح فرمایا آپ نے''

''اردو ادب کے کس شعبے سے..........؟'' (کھردرے لہجے میں)

''جی میں.....افسانہ نگار ہوں''

''کیا کہا.....تم.....افسانہ نگار ہو.....کھڑے ہو جاؤ.....''

''جی.....؟ کیا کہا آپ نے.....''

''اونچا سنتے ہو.....میں نے کہا کھڑے ہو جاؤ.....'' مدِ مقابل کے لہجے کی کرختگی اور تحکم کے

زیر اثر، اچھل کر میں سامنے جا کھڑا ہوا اور آنے والے خطرات کی بابت مختلف طرح کے اندازے لگانے کی کوشش کرنے لگا۔

''اچھا تو تُو..........افسانہ نگار ہے.....'' (میرے گرد چکر لگاتے ہوئے چبا چبا کر یہ الفاظ ادا کئے گئے..........)

''اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو تُو ...... ''زباں بندی'' والا چپڑ قناتی ہی ہے.....'' غصہ، تاؤ اور جھنجھلاہٹ لفظ چپڑ قناتی پر لازمی تھی مگر اثبات میں گردن ہلانا میری مجبوری تھی۔

''تجھے اندازہ ہے..... کچھ اندازہ ہے تجھے.....(غصے سے زمین پر لاٹھی مارتے ہوئے) تُو نے ''زباں بندی'' لکھ کر.....کتنا بڑا جرم کیا ہے.....''

''ن.....نن.....نہیں''

''کتنی کہانیاں ہیں تیری زباں بندی میں..........؟''

''جی.....جی.....تئیس.....''

''یعنی! .....تُو نے زباں بندی کی آڑ میں لب کشائی کر کے.....ایک نہیں.....دو نہیں..... پورے تئیس فساد پھیلائے ہیں دنیا میں.....؟''

''جی.....کیا کہہ رہے ہیں آپ.....فساد اور میں.....؟''

''ہاں.....ہاں.....فساد.....اور نہیں تو کیا.....اپنے آپ کو بڑا مبلّغ، ریفامر اور سوشل سائنٹسٹ سمجھتا ہے تُو.....تیرا کیا خیال ہے.....تیری لکھی ہوئی معاشرتی کہانیوں سے کوئی انقلاب رونما ہو سکتا ہے.....بے وقوف ہے تُو.....بلکہ جاہل بھی.....احمق انسان! تُو نہیں جانتا.....کہ تیری زباں بندی نے خلقِ خدا کو کتنے آزار میں مبتلا کر دیا ہے.....تیری لکھی ہوئی کہانیوں کے باعث نہ جانے کتنے پوشیدہ زخم، ناسور کی شکل میں نمودار ہو گئے ہیں۔ جن کا علاج تیرے اور اس دور کے جغادریوں کے بس میں تو کیا.....تیرے اصل آقاؤں کے بس سے بھی باہر ہے..........''

''آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب.....میں تو پریشان ہو گیا ہوں.....''

''جاننا چاہتا ہے.....جاننا چاہتا ہے تُو اپنے اعمال کی حقیقت.....؟''

''جی.....جی ہاں.....جی ہاں.....'' کچھ دیر کے لئے شخص مذکور نے بولنے سے اجتناب کیا اور تھوڑی دیر کے غور و فکر کے بعد جب اس نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا تو وہ غصے سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ پل بھر کو بہت سے شائبے میرے ذہن میں نمودار ہوئے مگر اس کے ہاتھ میں پکڑی

چھڑی کو زور زور سے زمین پر مارنے کے باعث آنے والے سگنل درہم برہم ہو گئے۔

''کون سی نعمت...... خدا کی عطا کردہ کون سی نعمت دستیاب نہیں تھی روشنیوں کے شہر میں۔ کتنے مہذب، تعلیم یافتہ اور کشادہ دل لوگ بستے تھے وہاں......... کتنا غریب پرور شہر اور کیسا انسان دوست خطہ تھا وہ.......... ان کی شکلیں، لباس، زبان، ثقافت، رہن سہن حتیٰ کہ کھانا پینا الگ ہونے کے باوجود ایک خاندان کا گمان گزرتا تھا اُن پر........ پُرامن عبادت گاہیں، پُرجوش درس گاہیں، کشادہ اور بارونق سڑکیں جہاں دن اور رات میں مشکل سے تمیز ہوتی تھی......... تُو نے......... ہاں ہاں تُو نے......... ذرا سے لسانی مسئلے کو ہوّا بنا کر ان سیدھے سادھے لوگوں کو زباں بندی پر مجبور کر دیا......... تجھ جیسے کم علم اور کم فہم کو کیا معلوم! زبانوں پر تالے پڑنے سے انسانوں کی بہت سی حسیں بیدار ہو جایا کرتی ہیں جن کے زیر اثر ان کے ہاتھ اور پیر بھی حرکت میں آنے سے نہیں روکے جا سکتے........ روشنیوں کے شہر کے مکینوں کی زباں بندی کے بعد ان کے پاس ہاتھ کھولنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا...... قرطاس و قلم کے عادی ہاتھ......... ایسے کھلے......... ایسے کھلے......... کہ جن معصوم بچوں کے شانے کتابوں کا بوجھ سہنے سے معذور تھے ان میں کلاشنکوف کا وزن سہنے کی قوت آ گئی......... آن کی آن میں......... اتنا خون خرابہ اور انسانیت کی اتنی تذلیل ہوئی کہ قیامت تک بھی اس کا ماتم کیا جائے تو کم ہے......... تمام تر خونریزی، تباہی اور بربادی کا ذمہ دار......... تُو ہے......... فقط تُو''

بکھرے ہوئے اوسان سمیٹ کر میں وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا کیونکہ غصہ اور طویل کلامی کے باعث اس کا سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا تھا کوشش کے باوجود میں اپنے پیروں کو قطعی جنبش نہ دے سکا۔ میرے پیر نہ صرف بوجھل بلکہ تناور درخت کی مانند زمین میں پیوست ہو چکے تھے۔

''دوسرا تیر...... اپنی دانست میں تُو نے ''سیفٹی اور سیف گارڈ'' لکھ کر مارا ہے...... معلوم ہے...... کچھ معلوم ہے تجھے...... تیری کہانی لکھنے سے قبل جو لوگ تمہارے خلاف درپردہ سازشیں کیا کرتے تھے اور انہیں خفیہ رکھنے کے لئے سو سو جتن کرتے تھے...... اب کھل کر...... کھل کر سامنے آ گئے ہیں...... تیری کہانی لکھنے کے بعد نہ تو تیری قوم کے کسی فرد کے کان پر جوں رینگی نہ کسی کے منہ سے ایک لفظ ادا ہوا اور نہ کوئی احتجاج کے لئے گھر سے باہر نکلا...... جس سے انہیں خوب ہلہ شیری ملی۔...... اب وہ نہ صرف علی الاعلان تمہارے خلاف سرگرمِ عمل ہیں بلکہ

تمہارے ہی ہڑپ کیئے گئے مال کے عوض' تمہارے دیسی آقاؤں سے غلاموں سے بھی بدتر سلوک کرتے اور مستقبل کے نقشوں میں بہ زعم خود تمہارے وجود کی نفی پر کمربستہ نظر آتے ہیں ...... یہ کوئی عام جرم ہے...... یہ بہت بڑا اور قومی جرم ہے............''

میں تو جی بڑا معمولی انسان ہوں...... آپ مجھے کہاں ....؟''

''ایک بات مجھے یہ بتا کہ سارے جہاں کا درد' تیرے ہی سینے میں کیوں اٹھتا ہے......؟ اگر لٹے پٹے مہاجرین میں سے کچھ نے مجبوری اور کچھ نے ضرورت کے تحت اپنی ذاتیں تبدیل کر لی تھیں تو اس میں تیرا کون سا نقصان تھا...... دیوانے کہیں کے...... ان کے اس فعل سے کسی کو کوئی نقصان پہنچا ہے تو صرف انہیں جو اس عمل کے مرتکب ہوئے ...... قدرت نے انہیں دنیا میں ہی' جیسے کو تیسا کا نمونہ دکھلا دیا...... سو باتوں کی ایک بات یہ کہ ہم میں سے کتنے لوگ' وثوق اور ثبوت سے خود کو' جدی پشتی خاندانی یا اعلیٰ نسل کا ثابت کر سکتے ہیں۔

ہر کوئی' دو چار یا چھ نسلوں پیچھے کامی تھا اور اپنے پیشے کی مناسبت سے دھوبی' نائی' لوہار' بڑھئی کے طور پر جانا جاتا تھا۔ تُو اگر پڑھا لکھا ہوتا تو تجھے معلوم ہوتا کہ دنیا کی تاریخ بے شمار انقلابوں اور ان کے ردعمل میں اسی طرح کی تبدیلی کے واقعات سے اٹی پڑی ہے جہاں آقا غلام اور مالک نوکر بن گئے تھے...... اسرار خودی لکھنے کا فائدہ تو کوئی نہ ہوا اَلبتہ تیری کہانی سے حوصلہ پا کر ...... سینکڑوں نہیں ...... ہزاروں نہیں ...... لاکھوں نو دولتیوں ...... ناجائز فروشوں اور رشوت خوروں نے اپنے اوپر اونچی ذاتوں کے لیبل چسپاں کر لئے ہیں...... آج تمہارے معاشرے میں بے بہا خانزادوں...... نوابزادوں...... شاہوں اور میاں اوّں کی کثرت کا سبب...... صرف تیری اسرار خودی کے ردعمل میں ہوا ہے............''

''نہیں جی...... میرا یہ...... مق............''

''نوکر کے کردار کو چٹخارے دار بنا کر تُو نے اپنی کہانی کو لچھے دار تو بنا لیا مگر تُو اس سے ثابت کیا کرنا چاہتا ہے یہ تجھے خود بھی معلوم نہیں...... تیرا کام تو بس قاری کو وقتی سکون اور لذت فراہم کرنا ہے...... تجھ میں اگر جرأت ہوتی تو تُو اس کہانی کے صحیح کردار...... درست مقام اور حقیقت پر مبنی پسِ منظر پیش کر کے اس معاشرے کی بہت سی گھناؤنی اور فرسودہ روایات کی نقاب کشائی کر کے سادہ اور معصوم لوگوں کا بھلا کر سکتا تھا............ مگر! تیرا مشن نیکی نہیں نیک نامی ہے............

تیرا کیا خیال ہے! تیری نشاندہی کے بعد لوگوں نے گھروں میں نوکر رکھنا بند کر دیے ہیں یا

اب نوکروں کی شکل میں فرشتے دستیاب ہیں ...... جس طوائف زادی کو تُو نے میاں صاحب کی بیوی کے روپ میں پیش کیا ہے وہ کوئی بھلی مانس تھی جس نے ضرورت کے لئے گھر سے باہر منہ مارنے کے بجائے گھر کے اندر ہی بندوبست کرلیا ...... باؤلے کہیں کے! تیری کہانی کے بعد عالی شان گھروں کی بیگمائیں اور داشتائیں ایسے نوکر' ڈنکے کی چوٹ پر رکھنے لگی ہیں جنہیں ...... خادم' گارڈ اور سیکریٹری کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے..........''

''آپ تو جی .... بات کا بتنگڑ بنا...............''

''سنا ہے! شب زیست کو تُو اپنا بڑا کارنامہ گردانتا ہے اور اپنے معاشرے کے گھناؤنے چہرے کی نقاب کشائی پر بڑا اتراتا پھر رہا ہے ...... تیرا اترانا جب درست مانا جاتا کہ تیری کہانی کے ردعمل میں رشوت کا خاتمہ ہو جاتا ...... ملاوٹ' بے ایمانی اور ناجائز منافع خوری سے لوگ تائب ہو جاتے' منشیات فروشی' سمگلنگ اور ناجائز اسلحے کے مکروہ کاروبار کی بیخ کنی کر دی جاتی ...... مانتا ہوں ...... میں مانتا ہوں کہ تیری کہانی سے قبل بھی یہ کام شدومد سے جاری تھے جبکہ تیری کہانی کے ردعمل میں کوئی چور پکڑا گیا نہ کسی بدمعاش کو گزند پہنچی لہٰذا ان کے حوصلے جوان ہو گئے اور انہوں نے اپنا گھناؤنا کھیل زیادہ زوردار طریقے پر کھیلنا شروع کر دیا ...... اب وہ تمام برائیاں جن کی نشاندہی پر تیرا سینہ فخر سے پھول جاتا ہے ...... دس گنا ...... بلکہ ...... سو گنا زیادہ ہو کر آزادی سے پھل پھول رہی ہیں جس کی تمام تر ذمہ داری تیرے سر ہے ....''

''میں نہیں مانتا جی .... یہ الزام ہے سراسر ....''

''تو جاہل ہے ...... کم علم ہے .... کم فہم ہے مگر بیوقوف ہرگز نہیں ...... اپنے گردوپیش کی کہانی کو تُو نے جس طرح دیدہ دانستہ کے نام سے' پرائے پسِ منظر میں پیش کیا ہے اس سے تیری چالاکی اور عیاری تو صاف ظاہر ہو ہی گئی ہے۔ ساتھ ہی یہ بات بھی مشاہدے میں آتی ہے کہ تُو دانستہ کسی سینئر' پیش رو کی نقالی میں اس قسم کی لذیذیت اپنی کہانیوں میں عام کر کے مصنوعی طریقے پر اپنا قد بلند کرنا چاہتا ہے۔ یہ بات ہرگز تیرے پیش نظر نہیں رہتی کہ نوعمر اور نابالغ اذہان پر اس قسم کی کہانیاں کیا اثرات مرتب کیا کرتی ہیں ایک طرح سے نشے کا عادی بنا دیتی ہیں انہیں ...... جب یہ نشہ ادبی کتابوں میں دستیاب نہیں ہوتا تو وہ غیر ادبی اور بازاری کتب کی جانب مائل ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا تیرے اوپر نوجوان نسل کو بے راہ روکرنے کا الزام نہ صرف سچا بلکہ مبنی برحقیقت ہے ....''

''آپ یقین کریں .... میں ایک سچا' پکا اور ....''

''ایک بات بتا! تُو کہانی نویس ہے یا بہروپیا! اے کوڑ ذوق ...... تجھے اتنا بھی خیال نہ آیا کہ استاد پوری قوم کا معمار ہوا کرتا ہے ...... پہلے تو یہ بتا! تجھ ایسے گھامڑ کو یہ حق کس نے دیا کہ تُو استاد جیسے مقدس پیشے کی اس طرح تذلیل کرے اور سرِعام نچا کر اس کو تماشا بنائے .... تُو تو ابھی طالبعلمی کے معیار پر پورا نہیں اترتا ...... تُو کس برتے پر ڈھٹائی دکھا رہا ہے اور بڑا اوا لکھنے پر اتراتا پھر رہا ہے ...... تُو نے ماسٹر لعل حسین کی جس فاطر العقلی کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے وہ سراسر گھڑیل، بودی اور بے بنیاد ہے جو تیرے میراقی ذہن کی خود عکاسی کر رہا ہے تجھے چاہئے کہ تُو ماسٹر لعل حسین کے بجائے خود ملنگی کا چولا پہن لے یا پھر کسی پاگل خانے کی راہ لے ....''

''حد کر رہے ہیں .... حد کر رہے ہیں آپ .... آخر میری ......''

''انگریزی آتی ہے تجھے ...... ہرگز نہیں ''جسٹس آف گاڈ'' کے نام پر تُو نے خدا کا قہر دکھلا دیا ہے ...... میرے خیال میں تیرے اندر چھپے احساسِ محرومی نے تجھے یہ کہانی لکھنے پر اکسایا ہے ...... تو اگر بزدل ہے ...... کم ہمت ہے ...... معاشرے کے ساتھ قدم ملا کر نہیں چل سکتا تو اس میں بیچارے جمی اور حرارہ کا کیا قصور ہے جو تُو نے' سوکنوں کی طرح کوسنے دینا اور ان کی برائیاں گنوانا شروع کر دیں ...... کاش! تیری نظر سے وہ حدیث گزری ہوتی ''کہ تم لوگوں کی پردہ پوشی کیا کرو اللہ تمہاری پردہ پوشی کرے گا'' ......

بیٹا .... اس حمام میں سب ننگے ہیں ۔ ہر کوئی اپنی بساط کے مطابق بہتی گنگا میں ہاتھ دھو رہا ہے ...... تُو کیوں مصنوعی طریقے پر وقت کا بقراط بننے کی کوشش کر رہا ہے ...... تُو نے کیا سارے زمانے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے ......؟''

''میں ...... میں ...... آپ سے مدد کا طالب تھا ...... اور آپ ......؟''

''تکمیل عہد'' میں کس چیز کا عہد دکھلایا ہے تُو نے ......؟ جو شخص محنت مزدوری نہ کر سکے وہ عصمت فروشی کا مکروہ دھندہ شروع کر دے مگر بھیک نہ مانگے ...... یعنی تیرے نزدیک بھیک مانگنے کی نسبت عصمت فروشی مستحسن اقدام ہے ......؟ میرے بس میں ہوتا تو میں تجھے تیرے شہروں کی پوش آبادیوں میں لے جا کر وہ عالیشان محل دو محلے دکھاتا جہاں تیری تکمیل عہد کے ردِعمل میں جا بجا فحاشی کے اڈے کھل گئے ہیں ...... اور محنت سے جی چرانے کی عادت کے باعث کھلے عام انسانیت کی تذلیل ہو رہی ہے جس کا سارا عذاب تیرے سر ہے ...... صرف تیرے سر ......!''

''دیکھئے......دیکھئے......میں اس طرز تخاطب کا......''

''میں نے پہلے بھی تجھے چیڑ قناتی اور مطلب پرست کہا ہے......میں اپنی رائے پر نہ صرف قائم بلکہ اور پختہ ہو گیا ہوں......اول تو ''گھوڑا' چنا اور انسان'' تیری سوچ کا آئینہ دار ہی نہیں......ضرور تُو نے اپنے کسی سینئر کا گھوٹا لگایا ہے......بالفرض محال! ہم اس خیال کو تجھ سے منسوب بھی کر لیں تب بھی تیرے بیان میں بڑا سقم ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ تُو نے ایک خاص کیمونٹی کو خوش کرنے کے لئے دانستہ یہ کہانی گھڑی ہے......خدا معلوم وہ لوگ تیرے اس کارنامے پر تجھ سے خوش ہوئے کہ نہیں البتہ! تیرے اس خود ساختہ مفروضے کے بعد......غریبوں کا واحد آسرا......چنے کی دال کی قیمت دیگر اجناس کی مانند آسمان سے باتیں کرنے لگی ہے اور یوں......غریب کے منہ سے نوالہ چھیننے کا جرم بھی تجھ سے سرزد ہوا ہے......''

''بلا جواز......بلا جواز......سارے زمانے کے جرائم میرے......''

''مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ تُو نے......''میں اور منصور'' بڑے جم کر لکھی ہے مگر تیری منتشر خیالی نے اس کہانی کو الجھن بنا کر رکھ دیا ہے جس سے تیرے دل میں چھپی بہت سی منفی خواہشات سر ابھارتی نظر آ رہی ہیں......اک بات بتا!''میں اور منصور'' لکھنے سے قبل تیرا ذاتی عمل طفیل سے مختلف تھا......؟ تیرا وسیع وعریض گھر' اونچا طرز زندگی تیری بد دیانتی کی چغلی نہیں کھاتے......کبھی تیرے دل میں اس کہانی کو لکھنے کے بعد احساسِ ندامت نہیں ابھرا کہ تُو بھی طفیل اور دیگر چودہ کروڑ پاکستانیوں کی طرح ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں کی جانب سے غافل ہو کر لہو لعب میں مبتلا ہے......گلہ کس بات کا......نشان دہی کس مسئلے کی......تُو تو خود مجرموں کی صف میں کھڑا ہو کر با آواز بلند اپنے جرم کا اقرار کر رہا ہے......''

''میں بزرگوں کی بہت عزت کرتا ہوں......کبھی کبھار پند و نصائح بھی برداشت کر لیتا ہوں......مگر......اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں......''

''تیرا حال تو اُس سیاسی لیڈر جیسا ہے جو اپوزیشن میں رہ کر جس مسئلے کی بابت ہلکان ہو رہا ہوتا ہے......اقتدار میں آ کر اسی مسئلے کی نفی کر رہا ہوتا ہے......گفتگو تو بھی بڑی لچھے دار کرتا ہے......جس بات کے حق میں تیرے پاس جتنے دلائل ہوتے ہیں اس سے زیادہ تُو اس کے خلاف بول سکتا ہے......''ستم آشنا'' تحریر کرنے کا تب فائدہ تھا جب یہ قبیح اور موذی بیماری' تمہارے ہاں نئی نئی وارد ہوئی تھی......مستند سروے کے مطابق اب تو تمہاری نوے فیصد آبادی اس کا شکار ہے......تمہارا کھانا' کمانا' رہنا سہنا' لین دین' میل ملاپ' نارمل انسانوں

جیسا کہاں رہا......؟ خود تیری طبیعت میں پائی جانے والی اضطراریت اور بے چینی اس کی نشاندہی نہیں کرتے ......؟ لوگوں کو تلقین کرنے سے پہلے اپنے قاری کو یہ بتا کہ نجات کی جو راہ تُو اُن کو دکھلا رہا ہے خود اس پر کس قدر گامزن ہے ......تُو کیا بتلائے گا تُو تو خود قول و فعل کے تضاد کا مریض ہے............''

''جتنا کچھ میں نے برداشت کیا......میری جگہ کوئی اور ہوتا......تو شائد......''

''ابھی ابھی تیری اور تیری قوم کی ذہنی صحت زیرِ بحث آ چکی ہے ......اب بھلا یہ بتا! جس مرحلے تک ''شیطان کی موت'' کا شکیل اور صادقہ پہنچ چکے تھے اس کے بعد عفت اور عصمت کے واعظ کی گنجائش رہ جاتی ہے بھلا......؟ کہانی پڑھنے کے بعد بلکہ بار بار پڑھنے کے باوجود قاری کو یہ سمجھ نہیں آتا کہ تُو خشک دودھ کے استعمال کو مضر گردان رہا ہے یا تیرے نزدیک ماں کی چھاتیوں کا لمس اہم ہے یا تیری کہانی کے ہیرو کی ذہنی کیفیت ماں کے زیرِ سایہ پرورش نہ پانے کے باعث عدم توازن کا شکار ہے......؟ جو کچھ بھی ہے تجھے لذیذیت درکار ہے سو تُو نے حاصل کرلی ......تیرا ذہنی افق دھندلایا ہوا نہ ہوتا تو تُو شکیل اور صادقہ کو دلدل میں دھنسا کر راہِ فرار اختیار نہ کرتا......سب سے بڑا ذہنی مریض تُو خود ہے......لہٰذا تیرا..........''

''حد کردی آپ نے......کون ہیں آپ......اور کس اختیار کے تحت یہ سب کچھ..........''

''جو لوگ! منہ زور اور بڑبولے ہوا کرتے ہیں اصل میں وہ ہوتے بے وقوف ہیں ......تمام تر کوشش کے باوجود تُو بھی اپنے من میں چھپی خواہشات کو چھپانے میں ناکام رہا ہے......''من و کامنا'' میں تیری ڈھکی چھپی خواہشات برہنہ شکل میں ظاہر ہورہی ہیں۔ تیری ناکام تمنا کا حال تُو جانتا ہے یا تیرا خدا......تیری کہانی کے ردِعمل میں ہر پاکستانی نوجوان کسی نہ کسی بھارتی حسینہ کے عشق میں مبتلا ہے اور اپنے سفلی جذبات کی تسکین کے لئے وہ بھارتی فلموں کا سہارا لے کر نہ صرف اپنے دل و دماغ کو آلودہ کررہا ہے بلکہ اپنی زبان و ثقافت سے بھی بیگانہ ہوتا جا رہا ہے......اور تو اور......تیری کہانی کے زیرِ اثر تیرے حکمران بھی ہر وقت ہاتھ میں راکھی لئے ہندیاترا کو بے چین رہتے ہیں......؟''

''ایک لفظ......مزید ایک لفظ بھی......میرے لئے اب ناقابلِ برداشت ہے............''

''چھوڑ......یہ بتا......تُو اتنا Passimistic کیوں ہے......کیوں ذرا ذرا سی بات پر لوگوں کے جذبات سے کھیلنے اور انہیں ٹھیس پہنچانے پر کمربستہ ہوجاتا ہے......کون کہتا ہے......کون کہتا ہے کہ تُو اپنے پیارے کتے کی موت کا سوگ نہ منا......بھلے مانس! انسانوں پر جانوروں کو

ترجیح تو نہ دے...... ایسا کرنا تیری مجبوری ہے تو کم از کم اس کی تشہیر ہی سے پرہیز کر لے...... تُو ایسا کر کس طرح سکتا ہے...... تیرا مسئلہ اپنے بڑوں کی نقالی ہے تُو نے بھی ان کی پیروی میں بے زبان جانور کا سہارا لے کر انسانوں کو مشقِ ستم بنایا ہے...... تُو جانتا ہے...... فی الوقت دنیا کی غالب اکثریت کی نیچر تیرے سوتیلے چچا کے مماثل ہوگئی ہے...... تیرے بہکاوے میں آ کر لوگ بے مروت انسانوں کی جگہ بامروت حیوانوں کو اہمیت دینے لگے تو یہ دنیا ایسا بھیانک جنگل بن جائے گی جس کے شہروں پر حیوانوں کی بستی کا گمان ہونے لگے گا...... ہوش کر...... ہوش کر...... وگرنہ......!''

''آپ...... آپ مجھے میرے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے...... مجھے آپ کی مدد............''

''تُو کیا سمجھتا ہے...... تیرے اس طرح جز بز ہونے سے تیرا نامۂ اعمال بند ہو جائے گا......؟ اور میں بھونڈی نقالی پر مبنی ''دو دھاری تلوار'' پر تجھے لتاڑنے سے دریغ کروں گا...... تیری یہ کہانی بھی بھونڈی نقالی کا شاہکار ہے۔ اپنے سینئرز کی طرح تو بھی اپنے سے بڑی عمر کی ہیروئن کے عشق کی ابتلائی داستان رقم کر کے شہرت کمانے کا آرزومند ہے...... غلط بالکل غلط...... تیرے سینئر...... جینئس لوگ تھے...... بات کرنے کا ڈھنگ جانتے تھے...... چھوٹے بڑے کی عزت و عصمت کا پاس کرتے تھے...... جب کہ تُو ان پڑھ...... جاہل اور گنوار ہے...... بات میں حسن پیدا کرنے کے بجائے اس کی شکل بگاڑ کے رکھ دیتا ہے...... تیرے پیشِ نظر پڑھنے والے کے جذبات و احساسات سے زیادہ اپنی خواہشات اہم ہوتی ہیں...... تیری کہانی...... کہانی کم...... رام کہانی زیادہ محسوس ہوتی ہے...... لہٰذا...... چھوڑ دے...... سادہ لوح عوام کو بیوقوف بنانا چھوڑ دے......''

''بے شک......! آپ عمر اور تجربے میں مجھ سے بڑے ہیں مگر اس کا یہ مطلب کہاں......؟''

''دیکھ...... اور غور سے سُن...... جس آدمی کی نفسیات میں کمی یا کجی رہ جائے وہ کسی نہ کسی شکل میں تشدد پسند ہو جاتا ہے اور لوگوں کو طرح طرح سے دکھ اور تکلیف میں مبتلا کر کے سکھ حاصل کرتا ہے۔...... تُو بھی اپنی کہانیوں کے ذریعے، اپنے کرداروں کے ساتھ پڑھنے والوں کو بھی طرح طرح کے مصائب کا شکار کیے ہوئے ہے............ بھلا! کوئی نارمل انسان...... شکیلہ جیسی خدا کی نعمت سے وہ سلوک کر سکتا ہے جو تُو نے اپنی کہانی ''بدنامی'' میں اس بیچاری سے کیا...... بے شک! قصور اس کا بھی تھا مگر اس کا بڑا حصہ دار تُو ہے...... زندگی کے دھارے کو الٹا گھمانے والا...... کبھی بھی...... ذہنی طور پر صحت مند نہیں ہو سکتا...... آئیڈیلزم اچھی چیز ہے

......مگر......حرکت کے ساتھ......وقت کی رفتار کے ساتھ......نہ شکیلہ اُس دور کی مخلوق تھی اور نہ فرقان باوا آدم کے زمانے کا...... پھر تُو نے آج کے شتابی دور میں کیوں موم سے لوہا پگھلانے کی کوشش کی......اس عمل کے بعد بھی تجھے کوئی ندامت نہیں ہوتی............؟''

''آپ نے تو...... مجھے زندہ درگور کرنے کا مصمم ارادہ کر رکھا ہے......بس کیجئے...... خدارا......''

''چل چھوڑ......ڈرامے نہ کر......سنا ہے! ''سنگساری'' لکھنے کے بعد تُو خود بھی کنفیوژن کا شکار رہا......جس چیز سے آدمی کی آشنائی نہ ہو۔اسے انکل پچّو ہاتھ لگانے اور چھیڑنے کا کیا فائدہ ......تُو کیا جانے فلسفہ کیا ہوتا ہے......تُو ٹھہرا نرا گاؤدی......تُو اگر یہ سمجھتا ہے کہ یہ کہانی لکھ کر تیرا شمار......فلسفی، ......دانشور...... مفکر یا مصلح کے طور پر ہونے لگا ہے تو...... تُو سخت حماقت میں مبتلا ہے...... تیری اپنی سمجھ میں یہ کہانی نہیں آئی......لوگوں کی سمجھ میں خاک آئے گی......تُو جا اور علی الاعلان ان لوگوں سے محبت کی پینگیں بڑھا۔جن کی محبت میں تیرا انگ انگ بیتاب و بے قرار ہے......اتار دے......اتار دے اپنے چہرے سے ہیومینٹی کا یہ مصنوعی ماسک اور پڑھنے والوں کو اپنا حقیقی چہرہ دکھادے......''

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں......آپ کو میری اس طرح ذلت کر کے کیا حاصل ہو......''

''کل ایک صاحب کہہ رہے تھے...... جب سے بدنامِ زمانہ ''زباں بندی'' منظرِ عام پر آئی ہے تب سے شریف لوگ، بہو بیٹیوں کے ہمراہ ریل گاڑی میں سفر نہیں کرتے...... بحالت مجبوری......سفر کے آغاز پر ریل کے ڈبے کو بہت ہوشیاری سے جانچ پڑتال لیتے ہیں۔مبادا اس میں ''پیا ملن کی آس'' کے مماثل کوئی شادی شدہ لفنگا ان کی بہو بیٹیوں کو بہکانے کی کوشش نہ کرے......یہ کہاں کی شرافت ہے......ڈھنڈورا تو سول لائیزیشن کا پیٹو اور کردار اوباش قسم کے تخلیق کرو جو شادی شدہ ہونے کے باوجود ہر وقت اور ہر جگہ آنکھ مٹکا کرنے کے لئے بے چین نظر آئیں......کیا تیری نظر سے اپنی برادری کے مہمان قلم کار کا یہ قول نہیں گزرا ''پہلی محبت...... دوسری عیاشی اور تیسری بدمعاشی ہوا کرتی ہے'' ......کیا قدرت نے تجھے قلمی صلاحیت......لوگوں کو عیاش اور بدمعاش بنانے کے لئے دی ہے......؟''

''بس کیجئے......خدارا بس کیجئے......میں اب یہاں ایک منٹ بھی نہیں ٹھہر سکتا......''

''مجھے تو پہلے ہی شک تھا......اب یقین ہو چلا ہے......تُو آدمی نہیں زنخا ہے...... ''جواب طلبی'' کے سردار کو بھرے مجمع میں کروفر کے ساتھ پیش کرنے والا ایک ناتواں آدمی کے سامنے کس

طرح منحنی صورت بنائے کھڑا ہے...... تیرا کیا خیال ہے...... میں تیری اس نوٹنکی سے دھوکا کھا جاؤں گا اور ''جواب طلبی'' جیسی فضول اور بے مقصد کہانی گھڑنے پر تیرے لتے نہ لوں گا...... ہر کہانی میں کوئی نہ کوئی ٹھوس پس منظر اور پیش منظر ہوتا ہے جس کے گرد سلیقے' قرینے اور ہنرمندی سے کہانی کا تانا بانا بُنا جاتا ہے جبکہ تُو نے بلا کسی ٹھوس بنیاد کے ایک موہوم خیال پر کہانی گھڑ ڈالی ہے جس کا مقصد بلا وجہ کی تبلیغ اور بے وقت کی نصیحت کے سوا کچھ بھی نہیں...... گُھور کیا رہا ہے...... شکر کر کہ میں تیری فضولیات کو کہانی سے موسوم کر رہا ہوں...... میرا بس چلے تو تیری اس لن ترانی پر اُسی طرح تیری مشکیں کسواؤں جس طرح تو نے سردار کی مشکیں کسوائی تھیں...... فرق اتنا ہو کہ مجمع کے سبھی افراد کے ہاتھوں میں ایک ایک پتھر تھما دیا جائے جو تیرے بیان کے آخر میں انہیں اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرنے کی اجازت ہو......''

''آپ کون ہیں......؟ اور کیوں داروغۂ زندان کی مانند میرے پیچھے ہاتھ دھو کر......؟''

''میں تو جو کچھ بھی ہوں...... اپنی جگہ پر ہوں...... تُو یہ بتا کہ تیرا اشار بھائی!...... دیوتا تھا...... فرشتہ تھا...... صوفی تھا...... سنت تھا...... یا ولی......؟ جو کچھ بھی تھا...... اتنا بے صبر...... گھٹیا...... اور بازاری طبیعت کا مالک کیوں تھا...... تجھ پر اس کے کشف و کرامات کا انکشاف جیل کاٹنے کے بعد ہی کیوں ہوا...... چل میرے ساتھ...... اور ملا دے ایک بھی سچے پیر فقیر سے...... یہ سب ڈھونگ ڈھکوسلا اور زندگی سے فرار کی راہیں ہیں...... تجھ جیسے بازاری ادیبوں نے کلاسیکل ادب کی بھونڈی نقالی اسی طرح شروع کی ہوئی ہے جس طرح ہر تھڑ لا شاعر میرؔ و غالبؔ کی زمین میں شعر گھڑنے کا شغل اختیار کئے ہوئے ہے...... تم تیسرے درجے کے افسانہ نگاروں نے بھی کلاسیکل ادب کے شاہکار افسانوں کی جگالی کا شغل اختیار کیا ہوا ہے...... ''قبولیت'' تیری آوارگی کا آئینہ دار تو ہو سکتی ہے یا تیری بیمار روح کی غذا...... افسانہ ہرگز نہیں......!''

''اچھا جی...... بجا...... سو فیصد بجا...... آپ کا ہر الزام منظور...... میری گلوخلاصی کی بابت بھی تو غور کیجئے......''

''ہوگا...... تیرے ہر ہر عمل پر غور و فکر ہوگا...... تُو نے قدم قدم پر لوگوں کو اسی طرح دھوکا دیا ہے جس طرح ''من کی کھڑکی'' کے ذریعے اپنے آپ کو کیمو فلاج کیا ہے...... میں تیری نوسر بازی میں آنے والا ہرگز نہیں...... بنیادی طور پر تیرا جھکاؤ ترقی پسندی' لبرل اپروچ کی

جانب ہونے کے باوجود تیری تمام عمر مغربی چکا چوند سے مرعوبیت میں گذری ہے.....تُو کب سے صراطِ مستقیم پر آ گیا اور داہنی سمت کا پر چارک بن گیا.....سیدھی سی بات ہے تُو بھی دیگر بورژواؤں کی طرح خون کی حدت کم ہونے کے باعث سادھوسنت کا روپ دھار کر' ڈگڈگی تھامنے پر مائل ہے.....تیرا یہ بہروپ ..... بڑھاپے کے حج ..... تیرتھ یاترا.....یا گنگا اشنان کی مانند..... میلہ لٹنے کے بعد کا واویلا ہے.....تم سب ..... جھوٹے..... فریبی.....اور مکّار ہو.....تمہارے قول وفعل میں تضاد ہے.....تم چاہے ''من کی کھڑکی'' کھولو..... یا.....تن کی کھڑکی ..... تمہارے ہاتھ کچھ آنے والا نہیں ..... میرا دعویٰ ..... بلکہ پیشنگوئی ہے..... جلد یا بدیر.....تم سب ناجائز دولت والے.....ایک ایک کر کے اپنے وطن کو چھوڑ جاؤ گے..... باقی بچیں گے.....مٹی کے متوالے.....وہی لکھیں گے سچی کہانیاں.....وہی کھولیں گے نئی اور تازہ ہوا کی کھڑکیاں ..... جا بھاگ جا..... دفع ہو جا..... میری نظروں سے ..... بھاگ جا..... بھاگ جا.....قبل اس کے.....''

''نہیں صاحب! .....اب تو میں .....اپنے آخری جرم .....یعنی ''مرگِ مفاجات'' کی بابت سزا سن کر ہی جاؤں گا..........''

''ہا..... ہا..... ہا.....اشکلے بھئی اشکلے ..... تُو تو میرے اندازوں سے بھی زیادہ چالاک نکلا .....! جو بات میں کہنا نہیں چاہتا تھا.....وہ تُو نے دریافت کر ہی ڈالی.....واقعی تُو بڑا اچنٹ نکلا ..... ''مرگِ مفاجات'' کو ہم ہرگز کہانی کا درجہ نہیں دیتے.....وہ تو ایک حقیقت ہے..... ایسی اٹل حقیقت ..... جو قدرت نے تیرے قلم کے ذریعے تیری قوم پر آشکار کی ہے..... تیری قوم' تیری آواز پر کان دھرتے ہوئے خوابِ خرگوش سے جاگ گئی اور اس نے مردانہ وار مقابلے کا فیصلہ کرلیا.....تو وہ بھی سرخرو ہوگی .....اور تُو بھی سرخرو ہوگا.....مرگِ مفاجات تیری نجات کا ذریعہ بنے گی .....وگرنہ تقدیر کا فیصلہ اٹل ہے.جس کے بے وقت انکشاف کی پاداش میں تجھے بڑی سے بڑی سزا کا مستحق گردانا جا سکتا ہے!!!

☆☆☆

مس کہکشاں

راہ داری میں تیز تیز چلتے ہوئے بہت سے سوالات سعد کے ذہن میں سر اٹھا رہے تھے۔ وقت کی قلت کا احساس بھی اسے شدت سے ستا رہا تھا' پانچ بجے کا مطلب دن ڈھلنے میں صرف دو گھنٹے رہ گئے تھے۔ سیٹ کنفرم کرانے کے بعد منزلِ مقصود تک مناسب سواری کا بندوبست اور وہاں پہنچ کر ڈھیر سارے لوگوں سے مل کر سب کی فرداً فرداً خیریت دریافت کرنا اپنے گھر کے تمام افراد کی جانب سے سب کی خیریت' بہت بہت سلام' دعا' پیار عرض کرنے کے بعد جوان سے بوڑھے ہونے والوں سے اظہار ہمدردی کرنا ان کی صحت اور علاج کی بابت معلوم کر کے اپنی جانب سے چند احتیاطی تدابیر کے ساتھ حوصلہ افزائی کے چند فرضی جملے بولنا' خواتین کی ڈھلتی عمر اور بڑھتے وزن کے باوجود ان کی سدا بہار شخصیت کے اعتراف میں زمین آسمان کے قلابے ملانا' بچوں سے بڑوں میں تبدیل ہونے والے نوجوانوں سے ان کی تعلیم اور مشاغل کی بابت تفصیلی گفتگو کرنا اور اس جہانِ ناپائیدار میں نئے آنے والوں کے نام اور نمبر یاد کر کے ان کے کپڑوں کی تعریف کرنا اور انہیں دوستی کی پیشکش کے ساتھ آئس کریم' کولڈ ڈرنک' برگر' ٹافی وغیرہ کی پیشکش کے ساتھ سیر و تفریح کے پروگرام طے کرتے ہوئے موسم کی بابت باخبر ہونا اور کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے اپنے ہاں کے موسم کی شان میں شاعری کی حدوں کو پار کر جانا۔

''کیا میں اندر داخل ہو سکتا ہوں؟'' سعد نے خدشات کو جھٹکتے ہوئے نیم وا

دروازے میں سے اندر جھانکتے ہوئے اجازت چاہی۔
''جی ضرور' تشریف لائیے'' موٹی موٹی مونچھوں اور گھنگھریالے بال والے خوش شکل نوجوان نے سر کے ساتھ ہاتھ کا بھی اشارہ کیا۔
سعد نے نوجوان کے اشارے کے بعد کرسی کو اپنی جانب کھینچتے ہوئے چاروں طرف گہری نظر دوڑا کر ماحول کا جائزہ لیا۔ اطمینان کی کیفیت طبیعت میں پیدا ہوتے ہی ساری پریشانیاں رفو چکر ہوگئیں۔ دفتر کی تبدیلی نے سعد کی قلبی کیفیت کو نارمل کر دیا تھا۔
''مجھے سعد کہتے ہیں' واپسی کی سیٹ تو کنفرم ہے چونکہ میں دوسرے شہر میں قیام پذیر ہوں گا اس لئے اڑتالیس گھنٹے پہلے روانگی کنفرم کرانا میرے لئے ذرا مشکل ہوگا۔ ایک ہفتہ کا ویزٹ ہے' آپ پلیز میری روانگی کنفرم کرا دیجئے۔'' ''عموماً یہ کام ہمارا ریزرویشن آفس چاندنی چوک کرتا ہے'' ہاتھ کے اشارے سے پاسپورٹ طلب کرتے ہوئے نوجوان نے ٹیلیفون کا ریسیور اٹھایا' ہیلو جی دلشاد بول رہا ہوں میرے ہاتھ میں پی کے 408 کا ٹکٹ ہے۔ یہ صاحب ابھی پاکستان سے آئے ہیں اور ان کا بلند شہر کا ویزہ ہے یہ چاہتے ہیں کہ اڑتالیس گھنٹے کے بجائے ان کی واپسی ابھی کنفرم کر دی جائے' جی نام ہے سعد سلمان سن آف سلمان سعید' جی جی اسلام آباد دلی' اسلام آباد وو کنگ ٹنگ فلائٹ'' ''اوہ مائی گاڈ' سوری سعد صاحب! بجلی کا بریک ڈاؤن ہونے کی وجہ سے کمپیوٹر آف ہوگئے ہیں آپ کو تھوڑا ویٹ کرنا ہوگا۔''
''یہ تو بہت مشکل ہو جائے گا' آپ کو علم ہے کہ میں نے ابھی دو گھنٹے کا سفر اور کرنا ہے'' ''آپ پریشان مت ہوئیے سعد صاحب! میں نوٹ کر لیتا ہوں دفتر سے اٹھنے سے پہلے میں آپ کا کام کر کے جاؤں گا بلکہ میں اڑتالیس گھنٹے پہلے بھی آپ کی طرف سے واپسی کنفرم کرا دوں گا۔ آپ ذرا یہ چٹ پاسپورٹ میں محفوظ کر لیجئے' واپسی پر چند منٹ کے لئے یہاں ہوتے جایئے گا آپ کو نوٹس کی باقاعدہ کمپیوٹر سلپ مل جائے گی' اس طرح آپ کسی بھی قسم کی پریشانی سے محفوظ رہیں گے۔''
''دلشاد صاحب! آپ یقیناً انڈیا سے ہیں''
''جی آپ کا اندازہ بالکل درست ہے' میں یہیں کرشن نگر میں رہتا ہوں''
''کبھی پاکستان آنے کا اتفاق نہیں ہوا آپ کا؟''
''بس صاحب! کیا عرض کروں لمبی داستان ہے' رشتہ دار تو بہت ہیں پاکستان میں غم روزگار

نے مہلت نہیں دی''

''کس شہر میں ہیں آپ کے رشتہ دار'' سعد نے پاسپورٹ کو ہینڈ بیگ میں ڈالتے ہوئے رسمی انداز میں دریافت کیا۔

''مختلف شہروں میں ہیں' میرے سگے ماموں لاہور گلبرگ میں رہتے ہیں بڑا اچھا کاروبار ہے ان کا۔''

''اچھا صاحب! کس نام سے ہے گلبرگ میں آپ کے ماموں کا کاروبار کبھی موقع ملا تو ضرور ملوں گا''

''نہیں سعد صاحب! کاروبار گلبرگ میں نہیں رہائش ہے' کاروبار کی بابت تو میں امی سے دریافت کر کے ہی بتا سکوں گا''

چلئے واپسی پر بتا دیجئے گا' ایک ہفتہ ہے آپ کے پاس' ایک بات ضرور عرض کروں گا' آپ سے مل کر بے انتہا خوشی ہوئی' میں یہ جملہ رسماً نہیں کہہ رہا'' سعد نے دلشاد کا ہاتھ گرمجوشی سے دباتے ہوئے کہا۔

اُف میرے خدا! یہ ری پلے تھا؟ سعد کا ذہن تیزی سے ایک دہائی پیچھے فلش بیک میں سفر کرنے لگا۔

''دفتر تو پی آئی اے کا ہے میرے خیال میں آپ؟''

''آپ تشریف رکھئے'' کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سانولی سلونی گھنگریالی بال والی لڑکی نما خاتون نے مسکراتے ہوئے کہا ''آپ کا اندازہ درست ہے جناب! میں یہیں دلی کے محلّہ سوئی والان کی رہنے والی ہوں' گریجویشن کرنے کے بعد گزشتہ تین سال سے آپ کی ملازم ہوں۔'' کال بیل دباتے ہوئے خاتون نے اپنا جملہ مکمل کیا۔

''مجھے شاید یہ بات نہیں پوچھنا چاہئے تھی''

''کوئی بری بات نہیں پوچھی آپ نے'' ''جی میم صاحب'' کال بیل کے جواب میں داخل ہوتے ہوئے چپڑاسی نے ہاتھ باندھ کر اور سر جھکا کر اپنے بلانے کا سبب دریافت کیا۔

''دو چائے لے آؤ''

''نہیں نہیں اس کی کیا ضرورت ہے''

''صاحب ہم سے کچھ کہہ رہے ہیں'' چپڑاسی نے پلٹ کر سعد کی طرف منہ کر کے ادب سے دریافت کیا۔

''نہیں نہیں تم جاؤ اور جلدی لے کر آؤ' آپ چائے پسند نہیں کرتے تو ٹھنڈے کے لئے کہہ دیتی ہوں۔''

خاتون نے نہایت وضع داری سے زور دے کر سعد کو لا جواب کر دیا۔

''آپ کبھی پاکستان نہیں گئیں مس؟''

''اجی صاحب! کیا عرض کروں لمبی کہانی ہے' کئی بار بلاوا آیا' کئی بار پروگرام بنا' نصیب میں ہو تب نا۔''

''پاکستان میں آپ کے عزیز کس شہر میں رہتے ہیں۔''

''ویسے تو دو تین شہروں سے خط و کتابت ہے' ہماری پھوپھی البتہ کراچی میں رہتی ہیں ان سے برابر رابطہ ہے۔''

''پھوپھی کبھی آئیں آپ سے ملنے''

''نہیں صاحب! وہ بڑے لوگ ہیں انہیں کہاں فرصت ہے ہمارے بارے میں سوچنے کی' بس ایک رسم ہے جو نبھ رہی ہے' آپ پہلی بار آئے ہیں انڈیا یا اس سے پہلے بھی آنا ہوا ہے؟''

''جی میں پہلی مرتبہ آیا ہوں' قیام پاکستان کے وقت میری بڑی ہمشیرہ شادی شدہ ہونے کے باعث یہیں رہ گئی تھیں' ان کے بیٹے چاند میاں کی شادی ہے' بڑے اصرار سے بلایا ہے انہوں نے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ بلند شہر سے بارات دہلی آئے گی۔''

''بس تو کوئی مسئلہ نہیں' آپ بارات کے ساتھ جس دن دہلی آئیں اسی دن مجھے فون کر دیجئے گا میں آپ کی جانب سے کنفرمیشن نوٹس دے دوں گی۔''

''اگر میں آپ کو بارات میں شرکت کی دعوت دوں تو آپ آئیں گی۔''

''مشکل ہے' خیر چھوڑیئے آپ ٹکٹ دیجئے' میں نوٹ کر لیتی ہوں آپ فکر نہ کریں سیٹ کنفرم سمجھئے۔''

''پاسپورٹ اور ٹکٹ تو حاضر ہیں مگر اپنے ہی شہر میں آپ کو ہماری خوشی میں شریک ہونے میں کیا قباحت ہے۔'' سعد نے پاسپورٹ اور ٹکٹ خاتون کی جانب بڑھاتے ہوئے گلہ مندی کا اظہار کیا۔

''سعد صاحب! ہندوستان کے مسلمان تو چالیس سال سے آپ کی خوشیوں کی قیمت ادا کر رہے ہیں' آپ لوگوں کو شاید اس کا اندازہ یا فرصت نہیں۔''

''جی......؟' آپ' میں کیا عرض کروں۔''

''آپ پریشان مت ہوئیے' شادی سے ایک دن قبل فون پر بارات پہنچنے والی جگہ کا پتہ اور فون نمبر لکھا دیجئے گا میں انشاء اللہ ضرور حاضر ہو جاؤں گی' مجھے یہاں سب لوگ مس کہکشاں کہتے ہیں۔''

''بابو صاحب !اب کھیالوں میں گم ہونے سے کرایہ تو کم نہیں ہو سکتا' اگر آپ کو ہماری بات پر جرا بھی سک ہے تو سامنے والے دفتر سے کھود معلوم کرلو۔''

سعد پریشان تھا کہ وہ کس وقت ٹیکسی ڈرائیور کے پاس پہنچا اور اس سے بلند شہر جانے کے لئے ٹیکسی کا کرایہ معلوم کیا جو اس نے چار سو پچاس بتلایا۔''ہاں ہاں مجھے منظور ہے اٹیچی ڈگی میں رکھ لو بیگ میں اپنے پاس رکھوں گا۔''

دہلی سے بلند شہر کا راستہ پبلک ٹرانسپورٹ میں عموماً ڈھائی سے تین گھنٹے کا ہے' ٹیکسی ڈرائیور نے دو گھنٹے میں سعد کو اس کی ہمشیرہ کے گھر کے سامنے لا کھڑا کیا۔

لو بابو صاحب! یہ ہے آپ کا بتلایا ہوا پتہ اب آپ کھود اتر کر گھنٹی ونٹی مارو۔

ایک دہائی کے خیالوں میں الجھے سعد کو ایک بار پھر ٹیکسی ڈرائیور نے شرمندگی سے دو چار کیا۔

''ارے ماموں آپ! کمال ہے' فون پر تو آپ نے' ارے میرا شہزادہ آ گیا''

گڈو کے جملے کو درمیان میں کاٹتے ہوئے سعد کے دولہا بھائی بغل گیر ہو گئے۔''

''اجی اندر بھی آنے دو گے بیچارے کو یا باہر ہی کھڑا رکھو گے'' سعد کی آپا نے بھرائی ہوئی آواز میں شوہر کو ڈانٹا۔''ہائے میرا چاند' میرا شہزادہ کتنا کمزور ہو گیا تو؟ اور ابا کیوں نہیں آئے' میں نے تو کہہ دیا تھا کہ ان کے بغیر گھوڑی نہ چڑھے گا ان کا نواسہ' اور بھیا دلہن کو بھی نہ لایا تو' تجھے پتہ ہے بچوں کو دیکھنے کے لئے میرا دل کتنا بے چین ہے' اور سنا میری بہنا کا کیا حال ہے اس کے بچے کون کون سی کلاس میں پڑھتے ہیں' اور ابا کی صحت کیسی ہے تصویر میں تو ایک دم دبلے لگے ہیں' میری گڑیا کا کیا حال ہے' اور بھیا وہ دلہن کا سوٹ تو بھیجا ہے نا ابا نے''

۔''اجی امی! ڈھیر ساری باتیں تم نے ایک سانس میں ماموں سے پوچھ ڈالی ہیں۔ ان کے پاس کالا علم تھوڑی ہے کہ فٹا فٹ سب کا جواب دے دیویں۔'' ہونے والے دولہا' چاند میاں کی مداخلت پر سعد کی جان میں جان آئی۔

''یار چاند میاں! ایک گلاس پانی تو پلواؤ''۔''اجی گولی مارو پانی کو یہ کوئی پانی پینے کا وقت ہے' ابے بھورے کھڑا میرا منہ کیا دیکھ رہا ہے' بھاگ کر جا ماموں جان کے لئے بوتل لے کر آ ٹھنڈی سی' اچھا ماموں ایک بات کان کھول کر سن لو' بلایا تو آپ کو امی نے ہے مگر آپ

کا سارا پروگرام میں نے تیار کرلیا ہے آپ کو اس پر عمل کرنا ہوگا۔''
''واہ بھئی دولہا میاں! آپ نے اپنے ساتھ میرا پروگرام بھی ترتیب دے دیا ہے' بہت خوب! ذرا تفصیل تو بتاؤ پروگرام کی؟''
''دیکھو جی! سب سے پہلے تو ہم کھانا کھائیں گے پھر بتنے کے ہوٹل پر چل کر چائے پئیں گے۔'' چاند میاں نے میرے بازو پر چٹکی کاٹتے ہوئے بات جاری رکھی۔''اور اس کے بعد ہم کھانے جائیں گے شنکر کا پان'۔''ماموں آپ ہماری بھی تو سنو بڑوں بڑوں کی سنے جا رہے ہو۔'' نجمہ باجی کی سب سے چھوٹی اور لاڈلی بیٹی تبسم نے گلہ کرتے ہوئے مداخلت کی؟
''جب تک آپ یہاں ہیں ہم آپ کے بغیر کھانا نہیں کھائیں گے اور نہ آپ کو کہیں جانے دے دیں گے۔''
''یہ کیسے ہوسکتا ہے میں نے تو بابو سے ماموں کی دعوت کی حامی بھی بھر لی ہے''
صادق نے پریشان ہوتے ہوئے التجائی انداز میں احتجاج کیا۔
''ابے اس خدائی فوجدار شاہجہاں کو بھول گئے ہو جو پہلے ہی ایڈوانس بکنگ کرا گئی ہے۔'' سعد کے بہنوئی نے بیڑی کو دانتوں میں گھماتے ہوئے کہا۔
''اجی! اس طرح تو احمد ماموں بھی سختی سے کہہ گئے ہیں' میرے دوستوں نے بھی مجھ سے وعدہ لیا ہوا ہے۔'' بائیں ہاتھ میں بندھے کلاوے کو آستین کے اندر چھپاتے ہوئے چاند میاں پریشان ہونے لگے۔
''ابا! کچھ بھی ہو ایک شام ماموں کو شکلو کی دکان پر لے کر ضرور جاؤں گا'' میں وعدہ کر چکا ہوں' عارف کا انداز بڑا فیصلہ کن تھا۔
''ارے چھوڑو اپنے پروگرام ماموں کو میرا بھیا اتنی دور سے تھکا ہارا آیا ہے اسے منہ ہاتھ دھو کر کچھ کھانے پینے تو دو۔''
''دولہا بھائی! آپ کو تو پتہ ہے میری مصروفیت کا' چاند میاں تم نے اور باجی نے تو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے' میں ایک ہفتہ ہی نکال سکا ہوں۔''
''ہیں؟'' آدھے لوگوں کے منہ سے ایک ساتھ 'ایک ہفتہ'
''پر ماموں! ایک دن مہندی کا' ایک مایوں کا' ایک بارات کا' ایک ولیمہ کا' ایک چوتھی کا' ہمارے پاس بچا کیا؟''
''ہماری محبتیں! جو ایک دوسرے کے دل میں ہمیشہ جوان اور تازہ دم رہتی ہیں۔''

''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی بھیا۔'' سعد کی تسلی پر نجمہ نے روہانسی ہو کر گلہ کیا۔ ''باجی آپ تو ساری صورتحال سمجھتی ہیں۔ ابا کی صحت اجازت نہیں دیتی' وقار' افتخار کالج جاتے ہیں' ساری ذمہ داری میرے کاندھوں پر ہے۔''

ابے باؤلو جو ہے اسے غنیمت جانو' جو نہیں ہے اس کے لئے بے تاب ہو رہے ہو' کیوں بے چارے کو پریشان کر رہے ہو۔'' سعد کے دولہا بھائی نے ساری صورتحال سمجھتے ہوئے فیصلہ صادر کیا۔

''اے ہے' واہ' واہ بھئی کیا کہنے' یہ سُسرا عارف تو اچھا بھلا نچنیا بن گیا۔ میاں دیکھ رہے ہو کہ نہیں''۔ ''جی دیکھ رہا ہوں دولہا بھائی' میں دیکھنے سے زیادہ سوچ رہا ہوں''۔ ''بھلا اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔'' سعد کے دولہا بھائی نے عارف کے ناچ سے نگاہ ہٹائے بغیر تجسس کا اظہار کیا۔ ''دولہا بھائی شادی کے دوران بھی اور اب وڈیو دیکھتے ہوئے بھی یہ سوچ رہا ہوں کہ آپ نے چاند میاں کی شادی پر ضرورت سے زیادہ خرچ کیا ہے کیا ضرورت تھی ڈھائی ہزار مہمان بلانے کی اور ناچ گانا کرانے کی۔ یہ ہی رقم آپ کے دوسرے بچوں کے کام آ سکتی تھی''۔ ''میاں بھائی کہاں کی باتیں کر رہے ہو' ہم ہندوستانی مسلمان آپ لوگوں کی طرح زیادہ دور کی سوچ نہیں سوچ سکتے' ہمارا تو ہر دن ہر گھنٹہ بلکہ ہر لمحہ غیر یقینی میں گزرتا ہے کیا پتہ کب شہر کی فضا خراب ہو اور دنگے فساد شروع ہو جاویں؟ میاں! فسادات کے دوران دیکھتے ہی دیکھتے اچھے بھلے رئیس فقیر بن جاویں ہیں۔ ہماری فکر چھوڑ و اور اپنی خبر لو' وہ تمہارے ماموں حامد صاحب کا' ہرکارہ آیا تھا تنصیر! شام کا کھانا تمہارا ان کے گھر ہے''۔ ''ارے مروا دیا دولہا بھائی' آج شام کے کھانے کا وعدہ تو افضال بھائی سے تین دن پہلے ہی کر چکا ہوں''۔ ''یہ تم جانو اور تمہارے ماموں' اس میں ہم دخل نہیں دے سکتے''۔ ''کچھ تو کیجئے دولہا بھائی میری تو ہمت جواب دے گئی ہے۔ حلوے مانڈے کھا کھا کر معدہ سوج گیا ہے۔ مہندی' مایوں' شادی' ولیمہ کے کھانے ہی کیا کم تھے اوپر سے دعوتوں نے مت مار رکھی ہے''۔ ''میاں خوش نصیب ہو' وگرنہ آج کل کے دور میں کون کسے پوچھے ہے''۔ ''ارے دولہا بھائی! میری خوش نصیبی کے لئے تو آپ سب کی محبتیں ہی کافی ہیں۔''

ہاں میاں! (ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے) ایک محبت کا رشتہ ہی تو باقی رہ گیا ہے' ہمارے اور تمہارے درمیان' خدا معلوم یہ بھی کب تک چلتا ہے؟''

''ابھی پورے چھتیس گھنٹے باقی ہیں' سعد ماموں کی روانگی میں اور ابا نے ابھی سے

سنجیدہ گفتگو شروع کردی ہے''۔ ''سنجیدہ گفتگو نہ کریں بے چارے تو ٹھٹھے ماریں۔ سعد میاں کو چاہیئے تھا جب آئے تھے تو کچھ وقت نکال کر آتے۔'' چاند میاں کی ساس نور جہاں آپا نے داخل ہوتے ہوئے دخل در معقولات کی۔ ''سعد میاں! سچ مانو تو ہمیں آپ کے آنے کا پتہ ہی نہ چلا'' دلہن کے والد خالو نثار صاحب اپنی جگہ خفیف ہو رہے تھے۔ ''چند دن اور رک جایئے نا۔'' نئی نویلی دلہن نے پہلی بار سب کے سامنے زبان کھولی۔

''ماموں اب بھی وقت ہے' ایمان سے' آپ حامی بھرلو' ایک منٹ میں سیٹ کینسل کرا کے دوسری تاریخ کی بکنگ کرا دوں گا''۔ ''ابے بھائی کیوں بے چارے کا راستہ کھوٹا کر رہے ہو''۔ ''لو جی! اگر بچوں کے اصرار سے میرا بھیا چند دن اور میری نظروں کے سامنے رک جاوے گا تو آپ کا کیا نقصان ہو جاوے گا'' نجمہ نے ڈبڈباتی آنکھوں سے سعد کے سر میں انگلیاں پھیرتے ہوئے شوہر کو ڈانٹا۔

ہمارا کوئی نقصان مقصان نہیں ہوگا ہم ادھر آپ کے پاس کھڑے ہیں' آپ فوراً گھنٹی مارو۔'' جی جی دولہا بھائی'' ''صاحب! ادھر آپ کس کو دولہا بھائی بولتا' آپ جلدی گھنٹی مارو اور ہمارے کو بھاڑا دیو' ہم کو اور بھی مزدوری کرنا ہے۔'' ''نہیں! ہاں' ہاں'' جیب سے پرس نکالتے ہوئے سعد نے ٹیکسی ڈرائیور کی طرف ایک ہزار کا نوٹ بڑھایا اور اسے واپس دلّی چلنے کا کہا۔ ''صاحب! خیریت تو ہے آپ ایک دم دلّی واپس کیوں جانے کو تیار ہوگیا''۔
''وہ' دلی میں گم ہو گیا ہے''۔ ''کیا گم ہو گیا ہے صاحب! پتہ' پتہ' دلی میں گم ہو گیا ہے۔

ہزار روپے کا نوٹ احتیاط سے بنڈی کی جیب میں ٹھونس کر' خوشی کو ضبط کرتے اور دھیرے دھیرے سر کو جنبش دیتے ہوئے ٹیکسی ڈرائیور نے ریورس گیئر لگا کر گاڑی کا رخ واپس دلّی کی طرف موڑ دیا۔ چند لمحوں بعد گاڑی پھر سے سرپٹ دلّی کی جانب دوڑنے لگی اس بار خیالوں میں گم مسافر کی بجائے مضبوط ارادے کا مالک ایک ایسا شخص عازم سفر تھا' جس نے نہ صرف ایک دہائی بلکہ پانچ دہائیوں کی کوتاہی کے ازالہ کا مصمم ارادہ کرلیا تھا۔

☆☆☆

شہیانہ مزاجی

''میں نے کہا! ذرا جلدی سے اٹھ کر دیکھو' باہر کیسا شور ہے؟'' صوبیدارنی نے روایتی گھبراہٹ میں پریشانی کا عنصر شامل کرتے ہوئے اپنے شوہر صوبیدار اسماعیل کا مونڈھا ہلا کر جگانے کی کوشش کی۔

''اللہ کا واسطہ' کبھی تو میری جان بخش دیا کر' میرا جینا تو پہلے ہی تُو نے حرام کر رکھا تھا اب تو سونا بھی حرام کر دیا ہے۔''

''میری بلا سے! چاہے پکے سو جاؤ' مجھے کیا پڑی ہے تم جیسے بے فیض آدمی سے مغز ماری کرنے کی' میں تو یہ کہہ رہی تھی باہر گلی میں بہت شور ہو رہا ہے اور ہمسایوں کے اونچا' اونچا بولنے کی آوازیں بھی آ رہی ہیں خدا خیر کرے کسی کی لڑائی تو نہیں ہو گئی۔''

''بندی خدا! ہوتی ہے تو ہونے دے' نہ میں تھانیدار لگا ہوں اور نہ تُو کوتوال'' تہبند کے دونوں سروں کو کھول کر پھر سے کستے ہوئے صوبیدار اسماعیل نے سلیپر میں پیر ڈالے اور کھونٹی پر ٹنگے کُرتے کی جانب اُچک کر ہاتھ بڑھایا۔

''السلام علیکم ڈاکٹر صاحب! خیریت تو ہے' یہ کیا ماجرا ہے۔ ہمارے محلے میں تو کبھی کوئی کسی سے اونچی آواز میں بات نہیں کرتا پھر یہ شور شرابہ کس بات پر ہے؟''

''میں بھی آپ کی طرح لاعلم ہوں۔ ابھی ابھی دفتر کی وین سے اترا ہوں' مجمع دیکھ کر ادھر آ گیا ہوں۔ وہ دیکھیے! سامنے حافظ صاحب کھڑے ہیں' ان کی دائیں جانب ایوب صاحب

بھی خاصے مصروف نظر آ رہے ہیں انہی سے مل کر صورتحال معلوم کرتے ہیں۔''
''آیئے' آیئے! میں سوچ رہا تھا کہ اتنے شور شرابے کے باوجود آپ دونوں گھر سے باہر کیوں نہیں نکلے۔'' دائیں ہاتھ سے چہرہ سہلاتے اور بائیں ہاتھ کو کولہے پر جماتے ہوئے حافظ زکریا نے صوبیدار اسماعیل اور ڈاکٹر افضل کو خوش آمدید کہا۔
''جی میں تو ابھی دفتر کی ......''
''قبلہ یہ فرمائیں یہ ہنگامہ ہے کیا؟'' صوبیدار اسماعیل کی دخل در معقولات پر ڈاکٹر افضل کا جملہ ادھورا رہ گیا۔
''اجی کیا عرض کروں' میں بھی آپ لوگوں کی طرح معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہوں مگر کامیابی نہیں ہوئی۔''
''کیسی انہونی بات کر رہے ہو برخوردار! یہی شکایت تمہاری جگہ اس بچی نے کی ہوتی تو بات سمجھ میں آنے والی تھی؟ تمہاری جانب سے اس قسم کا الزام' میری سمجھ سے باہر ہے۔'' ٹھیکیدار عجائب خان نے قراقلی ٹوپی کو سر سے اتار کر دائیں ہاتھ میں تھام لیا اور بائیں ہاتھ کو فارغ البال سر پر پھیرتے ہوئے تشویش کا اظہار کیا۔
''میں' میں تو چاچا جی کبھی چھوٹوں سے بدتمیزی نہیں کرتی' بھلا! عزیز کو گالی کیوں دوں گی یہ تو عمر میں مجھ سے پورا ڈیڑھ سال بڑا ہے۔'' لڑکی' جو ٹھیکیدار عجائب کے استفسار پر گھبراہٹ اور لکنت کا شکار تھی کسی قدر سنبھل' سنبھل کر اور اعتماد سے اپنا نقطۂ نظر بیان کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اب اس کی آواز گلے میں رندھنے کے بجائے لوگوں کو سنائی بھی دے رہی تھی۔
''یار! یہ لونڈا جب سے چار جماعتیں کیا پڑھا ہے اس نے محلے والوں کو کمی کمین بنا کر رکھ دیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا یہ چاہتا کیا ہے؟'' ماسٹر ذوالفقار علی نے بیزاری سے مجمع کے پیچھے منہ کر کے لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کیا۔
''کاکا! ایک بار پھر سوچ لے! تیری بات سچی نہ ہوئی تو ...... پھر تُو میرا نام جانتا ہے۔'' پہلوان آزاد نے تلوار کٹ مونچھوں کو مروڑتے ہوئے عزیز کو دھمکایا اور گلے میں پڑے ہوئے پھولدار مفلر کو زور سے جھٹک کر کندھے پر ڈالا اور داد طلب نظروں سے مسکرا کر لوگوں کی جانب دیکھنے لگا۔ جس سے اس کا پیتل کا مصنوعی دانت نمایاں ہو گیا جسے وہ سونے کا کہہ کر لوگوں کو مرعوب کیا کرتا تھا۔
''آرام سے بھئی آرام سے دونوں اپنے بچے ہیں اور ہمارے ہاتھوں میں کھیل کود کر بڑے

ہوئے ہیں۔ یقیناً کوئی نہ کوئی غلط فہمی ہوئی ہے ورنہ کل تک تو یہ خود آپس میں کھیلتے تھے۔'' لمبے قد کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ولایت حسین عرف شاہ جی دوکاندار نے ہاتھ میں پکڑے دودھ کے ڈبے کو نچاتے ہوئے مجمع کے بیچ و بیچ کھڑے' پستہ قد قاضی دلاور حسین کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی جن کی آواز اُن کے قد سے زیادہ اونچی ہو رہی تھی۔

''حیرت ہے بھئی! جہاں اتنے معاملہ فہم بزرگ موجود ہوں وہاں چھوٹی سی بات بتنگڑ بن جائے؟ چلو بھئی بچو! آپ لوگ اپنے گھروں کو جاؤ اور نوجوانوں کا بھی یہاں کوئی کام نہیں یہ مسئلہ ایسا نہیں ہے کہ اسے تماشا بنایا جائے۔ حافظ صاحب' قاضی صاحب' ٹھیکیدار صاحب' صوبیدار صاحب اور شاہ صاحب' آپ لوگ یہاں ٹھہریں باقی سب حضرات تشریف لے جائیں۔''

ڈاکٹر افضل نے اپنے علم' تجربے اور تحمل مزاجی کو بروئے کار لاتے ہوئے مسئلے کو پیچیدہ ہونے سے بچایا۔

''میرا خیال ہے! گفتگو کے لئے یہ جگہ نامناسب ہے اگر آپ لوگ پسند کریں تو میرے غریب خانے پر تشریف لے چلیں وہاں آرام سے بیٹھ کر بچوں کا مؤقف سنیں گے یقیناً کوئی بہتر حل نکل آئے گا اور اسی بہانے چائے کا ایک کپ بھی نوش فرما لیجئے گا۔''

''او نہیں جی حافظ صاحب! اس طرح تو مسئلہ اور طول پکڑ جائے گا۔'' قاضی دلاور حسین نے حافظ زکریا سے اپنے روایتی اختلاف کا فائدہ اٹھا کر طنز کا تیر چلایا۔ ''آپ کی طرح تمام لوگ فارغ البال نہیں ہیں سبھی کو کوئی نا کوئی کام کرنا ہے جو کچھ فیصلہ کرنا ہے جلدی کریں اور یہیں پر کریں یہ بھی تو اپنا ہی محلہ ہے۔''

''ہاں تو بیٹا! ڈرنے اور خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں' سچ سچ بتاؤ بات کیا ہے؟'' ڈاکٹر افضل نے عینی کو براہِ راست مخاطب کیا جس کا پورا نام قرۃ العین تھا گھر والے پیار سے عینی کہا کرتے تھے۔ عینی کے والد روزگار کے سلسلے میں بیرون ملک گئے ہوئے تھے جبکہ عینی کی والدہ بطور اسکول ٹیچر ملازمت کیا کرتی تھیں۔ عینی کل پانچ بہن بھائی تھے جن میں عینی سب سے بڑی تھی اور اسی سال میٹرک کرنے کے بعد کالج میں داخل ہوئی تھی۔

''میں خدا پاک کی قسم کھا کر کہتی ہوں انکل! میں نے کوئی بات نہیں کی۔''

ڈاکٹر افضل کے استفسار پر لڑکی پھر سے گھبراہٹ کا شکار ہوگئی اور اس نے جلدی' جلدی اپنے جملے اس طرح ادا کئے جیسے کلاس میں بچہ سبق یاد نہ ہونے کے باعث غیر یقینی انداز میں استاد

کے حکم پر سبق سنانے لگے۔
''بیٹا جی! یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ آپ کہتی ہو' کوئی بات نہیں ہوئی اور برخوردار کہتا ہے کہ آپ نے اسے گالی دی ہے۔''
''جی بالکل! میں صحیح کہہ رہا ہوں۔'' حافظ زکریا کی مداخلت پر لڑکے نے در مداخلت کی۔
''تم چپ کرو میاں! تمہاری باری جب آئے تب بولنا۔'' ماسٹر ذوالفقار کے تحکمانہ لہجے نے عزیز کو خاموش کرا دیا۔
''انکل جی! میں ہر طرح کی قسم اٹھانے کو تیار ہوں۔ میں نے عزیز سے ایک لفظ تک نہیں کہا۔'' لڑکی کے لہجے میں روہانسگی اور التجا نمایاں ہو گئے تھے۔
''یار عزیز! یہ کیا ماجرا ہے؟ بات صاف' صاف کیوں نہیں کرتے۔ عینی کہتی ہے کہ اس نے ایک لفظ تک نہیں بولا اور تم کہتے ہو کہ اس نے تمہیں گالی دی ہے۔''
''جی! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں' آپ میرا یقین کریں۔'' عزیز کا جواب سن کر ڈاکٹر افضل جیسے تحمل مزاج شخص کے چہرے پر بھی تشویش کی لہر نمایاں ہو گئی اور وہ بے بسی سے دوسرے لوگوں کی طرف دیکھنے لگے۔
''تم اسے چھوڑو بیٹا! مجھے بتاؤ کہ قصہ شروع کیسے ہوا؟'' ولایت حسین عرف شاہ جی دوکاندار نے عینی کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے دریافت کیا۔
''انکل جی! آپ میرا یقین کریں' میں نے ....'' ''بیٹا' بیٹا! ہمیں تمہاری بات کا پورا یقین ہے تم صرف یہ بتاؤ کہ بات شروع کیسے ہوئی؟'' صوبیدار اسماعیل نے عینی کو درمیان میں ٹوک کر دریافت کیا۔
''آج میرا کالج میں پہلا دن تھا۔ میں چھٹی کر کے گھر واپس آ رہی تھی کہ راستے میں عزیز مل گیا اور بولا'' ''یعنی آپ نے کوئی بات نہیں کی سلسلہ کلام عزیز نے شروع کیا۔''
''جی .... جی ہاں!'' ڈاکٹر افضل کے سوال پر عینی نے اعتماد سے جواب دیا۔
''بیبیو! آپ لوگ کیوں اپنا وقت ضائع کر رہی ہیں' کچھ تو عقل سے کام لو' یہاں کام کی باتیں ہو رہی ہیں کوئی کھیل تماشا تھوڑی ہو رہا ہے' جاؤ اپنا اپنا چولہا ہانڈی کرو۔'' سگریٹ کا گل جھاڑ کر چھتوں اور دیواروں سے نظارہ کرنے والی خواتین کو مخاطب ہو کر پہلوان آزاد نے رُعب جمایا تو تمام خواتین سروں پر دوپٹہ لیتے ہوئے اپنی چوری پکڑے جانے پر شرمندہ ہو گئیں اور چھتوں' دیواروں سے نیچے اُتر کر جھروکوں اور سوراخوں سے نظارہ کرنے لگیں۔

''لومیاں عزیز! نماز کا وقت ہو رہا ہے جلدی سے بتاؤ سچ کیا ہے۔'' ایوب صاحب نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھتے ہوئے عزیز کو وارننگ دی۔
''انکل آپ مجھے کب سے جانتے ہیں؟'' ''ابے جب سے تو پیدا ہوا ہے تب سے اور کب سے؟'' ٹھیکیدار عجائب نے عزیز کے سر پر چپت رسید کرتے ہوئے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔
''اوہ میں تو اس کے باپ کی شادی سے پہلے کا واقف ہوں اس کے خاندان کا! اللہ بخشے بڑا ہی نیک انسان تھا۔''
''مسئلہ اس کا ہے اس کے باپ کا ذکر کہاں سے آ گیا۔ بس کرو بھئی عزیز بس کرو بات سیدھی اور دوٹوک ہونا چاہئے۔ قاضی دلاور حسین نے فیصلہ کن انداز میں اپنے غصے کا اظہار کیا۔
''میں اور عینی بچپن سے اب تک ایک ساتھ کھیل کود کر بڑے ہوئے ہیں۔ ابھی ابھی اسماعیل انکل نے میرے خاندان کی شرافت کا ذکر کیا ہے۔'' ''ہاں بابا ہاں! اسٹامپ لکھوا لے، تو شریف، تیرا باپ شریف، تیرا دادا...... '' پہلوان آزاد نے گفتگو کی طوالت پر ناراضگی کا اظہار کیا۔
''آزاد صاحب! آرام سے، آرام سے، اس طرح بچے ڈر جائیں گے اور ہم معاملے کی تہہ تک نہیں پہنچ پائیں گے۔ جی تو بیٹا! جلدی سے آپ اپنی بات مکمل کیجئے تاکہ کوئی نتیجہ برآمد ہو سکے۔''
''میں سمجھتا ہوں بلکہ حیران بھی ہوتا ہوں۔ مجھ سے پہلے یہ بات آپ کے ذہن میں کیوں نہ آئی۔ (ڈاکٹر افضل کو مخاطب کرتے ہوئے عزیز نے اپنی بات جاری رکھی) اور آپ ہی پر کیا موقوف ہمارے دیگر پڑھے لکھے اور روشن فکر بزرگوں کو یہ خیال کیوں نہ آیا۔ جسے سوچ اور محسوس کر کے میں خود اپنی نظروں میں انتہائی درجے کا مجرم بن چکا ہوں۔ میرے احساسِ جرم میں میرے ساتھ نہ صرف آپ تمام حضرات بلکہ دنیا کے وہ تمام مرد شامل اور سخت تعزیر کے مستحق ہیں جن کی شہبیانہ مزاجی کے زیرِ اثر آج کے ماڈرن، مہذب، کلچرڈ اور ترقی یافتہ دور کی عورت، آج بھی عدم تحفظ کا شکار ہو کر ہماری ہوس ناکی سے بچنے کے لئے نقاب لینے پر مجبور ہے......!
میرے بچپن کی ساتھی، قرۃ العین نے نقاب لے کر مجھے ایسی گالی دی ہے جس سے میں اور میرا ضمیر ندامت کی انتہاؤں پر پہنچ گئے ہیں۔ یہ گالی میری اکیلی ذات پر منطبق نہیں ہوتی۔ یہ ہم

سب مردوں کی ذات کے لئے شرمناک چیلنج ہے۔ یہ ہمیں اس وقت تک ذلت کی پستی سے سر ابھارنے نہیں دے گا جب تک ہم اپنی نصف بہتر کو اپنے مہذب ہونے کا ثبوت اس طرح فراہم کرسکیں کہ اس کے دل، دماغ شعور اور لاشعور سے عدم تحفظ کا احساس ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دور ہو جائے ......اور......وہ ہماری طرح آزاد و خود مختار زندگی بسر کر سکے۔

☆☆☆

آواگون

بہت ہی قابلِ رحم اور ترس کے لائق ہوتا ہے وہ شخص جو پڑھا لکھا ہوتے ہوئے کسی جاہل کی پناہ میں اپنے مسائل کا حل ڈھونڈ رہا ہوتا ہے۔ جیسے ہم! لیلیٰ کی مسیحائی کی جستجو میں حاجی مستری تک پہنچے تھے۔ حاجی صاحب کی پورے شہر میں دھوم تھی۔ دور دراز سے مایوس و نامراد لوگ آس لگا کر آتے اور اپنی مراد پاتے۔ چٹے ان پڑھ ہوتے ہوئے بھی اپنی برادری میں فلسفی اور دانشور کا درجہ رکھنے والے حاجی مستری کے روبرو ہم جیسے علمی ڈگریوں کا بوجھ اٹھانے والے پروفیسر بھی پھیکا پکوان ثابت ہوتے. اور گونگوں کی مانند سر ہلا ہلا کر ان کی خود ساختہ حکایتوں کی داد دیا کرتے۔

آپ کو حق ہے ہم سے ہماری بے چارگی کا سبب دریافت کریں۔ اس کے ذمہ دار ہم سے زیادہ ہمارے احباب اور بیگم صاحبہ ہیں۔ جناب! افسرانِ بالا نے ہماری کارگزاریوں کے عوض اسٹنٹ سے ترقی دے کر ہمیں پروفیسر بنا دیا تو اس میں ہمارا کیا قصور تھا؟ ایسا لگا کہ یہ تمام لوگ ہمیں قربانی کا بکرا بنانے کے لئے ادھار کھائے بیٹھے تھے۔ اسٹیٹس تو بہانہ تھا وگرنہ جب ہمیں فکر نہ تھی اپنے اسٹیٹس کی تو یہ لوگ ہمیں صاحبِ کار ہونے کی تاکید کرنے والے کون ہوتے ہیں؟ بھئی کار کا شوق کسے نہیں ہوتا! کون دھوپ، بارش اور سردی میں خوار ہونا چاہتا ہے۔ جیب بھی تو اجازت دے۔ جس بات کا ہمیں ڈر تھا، ہو کر رہی یعنی ہماری عمر بھر کی پونجی اور جی پی فنڈ سے معقول ایڈوانس ملا کر بھی ایک عدد پرانی کار کے ہم پلہ

نہ ہو سکے۔ ہر روز کی موسمی بیماریاں اوران کا تدارک ہمارا دردِ سر بن گیا۔اسٹیٹس کے خلجان میں مبتلا بیگم واحباب مزے میں اور ہم حاجی مستری کے شکنجے میں۔

آپ یقیناً لیلیٰ کی بابت سوچ رہے ہوں گے۔ جناب! یہ سرو قد' حسین وجمیل دوشیزہ کا نام نہیں۔ یہ ہماری نئی مصیبت کا نام ہے جسے احباب کے اصرار پر ہم نے موٹر کار کی شکل میں خود پر نازل کیا ہے۔جس طرح منہ زور اور ہٹ دھرم بیوی کے ساتھ اس کے گھر والوں کے ناز نخرے اٹھانا شریف شوہر کی مجبوری ہوا کرتی ہے اسی طرح نازک مزاج لیلیٰ کے ساتھ اس کے معالج' حاجی مستری کی ناز برادری بھی ہمارا مقدر بن چکی تھی۔

لیلیٰ پرانے وقتوں کے نوابوں اور رئیس زادوں کی ناز برداریوں کے مزے لوٹنے کے باعث بہت سی پیچیدہ اور پرانی بیماریوں کے علاوہ اسٹارٹنگ ٹربل' ہیٹ اپ' مسنگ اور دھوئیں کی زیادتی کا اکثر شکار رہتی۔حاجی مستری ایسے ہی دائمی مریضوں کے ماہر معالج تھے جن کے علاج سے مریض تو کسی قدر شفایاب ہو جاتے مگر مالکان اکثر بیمار و مضمحل رہنے لگتے کیونکہ ان کا بیشتر وقت حاجی صاحب کی بدبودار ورکشاپ' میلے کچیلے غلیظ شاگردوں اور ''بیں بیں'' کرتے دنبوں کے بیچ گزرتا جنہیں سال کے سال قربانی سے بہت پہلے خرید کر پالا پوسا جاتا۔حاجی مستری صاحبِ ذوق آدمی تھے ان کے کپڑے اور ہاتھ کتنے بھی گندے ہوتے چہرہ البتہ توے کی طرح شفاف ہوتا۔کالا رنگ قدرت کی دین تھی جسے مزید داغدار کر کے وہ گناہ کے مرتکب نہ ہوتے۔شاگردوں میں امتیاز کرنا مشکل ہوتا۔کون منیر ہے اور کون نذیر' حاجی صاحب کسے کالو کہہ کر بلاتے ہیں اور چھوٹا کس کا لقب ہے۔ ہمارے خیال میں اس کی وجہ ان کی عدیم الفرصتی تھی۔علی الصبح کام پر آ کر رات گئے گھر لوٹ کر ہاتھ منہ دھونا ایک طرح سے وقت کا ضیاع تھا۔ ہفتے کی صبح آپ تمام شاگردوں میں بخوبی تمیز کر سکتے تھے کیونکہ جمعہ کے جمعہ نہانا اور کپڑے بدلنا ان کا معمول تھا۔ ہفتے میں ایک یہی دن ان کا اپنا ہوتا جس میں ان کی شکل' ان کا لباس اور مصروفیات ان کی مرضی کے مطابق ہوتیں۔ باقی کے چھ دن حاجی مستری کے کُلّی اختیار میں تھے جس کے ایک ایک پل کے لئے وہ حاجی مستری کے آگے جواب دہ تھے۔

حاجی صاحب کے تمام شاگردوں میں انہیں سب سے زیادہ عزیز منیر عرف گھوڑا تھا جسے وہ کبھی نہ بھولتے۔کوئی چابی' پانہ یا اوزار جب بھی انہیں درکار ہوتا وہ منیر کو گھوڑا کہہ کر ضرور پکارتے اگر اس کی جگہ کوئی دوسرا شاگرد آ جاتا تو حاجی صاحب جھلا کر کہتے! ''ابے وہ

گھوڑا کہاں مرگیا۔اس ماں کے فلانے کو بھیجو' ذرا میں بھی تو اس کے چہرہ مبارک کی زیارت کروں۔'' منیر کو ہر وقت اپنے قریب رکھنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ حاجی صاحب خود گاڑی کے نزدیک کم ہی جایا کرتے۔ان کی ٹیوننگ کی دور دور تک شہرت تھی وہ اپنے اڈے پر بیٹھ کر گاڑی کے مختلف پرزے مثلاً پلگ' پوائنٹ' ڈسٹری بیوٹر' کاربوریٹر' فلٹر وغیرہ منگاتے اور وہیں بیٹھ کر ان کا معائنہ کر کے درست کرتے۔آپ جب بھی گاڑی میں کسی نقص کی شکایت کریں وہ فوراً پان کی گلوری مسوڑھوں کے ایک سرے سے دوسرے میں منتقل کرتے ہوئے منیر عرف گھوڑے کو نیچے گھس کر چیک کرنے کی ہدایت کرتے جہاں سے واپسی پر اس کا داغدار چہرہ' میلے اور شکن آلود کپڑے کچھ اور رنگ آمیز ہو جایا کرتے۔ باری باری گاڑی کے مختلف پرزے ٹھونک پیٹ اور گھس رگڑ کر' منیر کو گاڑی میں فٹ کرنے کے لئے دیئے جاتے۔سب سے آخر میں سائڈ پاکٹ سے چشمہ نکال کر کاربوریٹر کے تمام سوراخوں کا بغور جائزہ لیتے اور موٹے سوراخ والی نلکی کو ہونٹوں میں دبا کر چھاتی کا پورا زور صرف کر کے سانس اندر باہر کھینچتے۔اس عمل کے دوران پٹرول کی کچھ مقدار ان کے پھیپھڑوں میں منتقل ہو جاتی جس کا وہ کبھی نوٹس نہ لیتے۔سب پرزوں کی فٹنگ کے بعد وہ منیر کو گاڑی اسٹارٹ کرنے کی ہدایت کرتے اور ساتھ ہی ایکسیلیٹر پر وزن ڈالنے کی تاکید کے بعد سائیلنسر کے نزدیک اکڑوں بیٹھ کر لمبی سانس اندر کھینچ کر دھوئیں کا لمبا گھونٹ بھر کر اپنی کارگزاری جانچتے اگر انہیں چھینک آ جاتی تو چہرے پر ناخوش گواری کے اثرات لئے وہ ایک طرف ہو کر دائیں ہاتھ سے ناک صاف کرتے اور بائیں ہاتھ میں قمیض کا سرا پکڑ کر اس سے ٹشو یا رومال کا کام لیتے۔اس کا مطلب تھا گاڑی کچا دھواں مار رہی ہے اور ٹیوننگ ٹھیک نہیں ہے۔اگر دھوئیں کا گھونٹ بھرنے کے بعد حاجی صاحب کے چہرے پر رونق آتی اور وہ آدھے کالے اور آدھے پیلے دانتوں میں پان کی گلوری گھماتے تو سمجھئے گاڑی سو فی صد درست ہو چکی ہے۔گاڑی کی درستگی کی صورت میں حاجی صاحب کی پہلی ترجیح چائے ہوتی جس کا وہ فوری آرڈر دیتے اور آپ کو بل کی ادائیگی سے پیشتر گاڑی کی بابت کچھ احتیاطی تدابیر کچھ حفاظتی نسخے ذہن نشین کراتے اور چائے کا کپ آپ کی طرف بڑھا کر منیر کو اوزار سنبھالنے کی ہدایت کرتے۔

ہم تو پہلی مرتبہ ہی حاجی صاحب کی چائے سے لطف اندوزی کے بعد شوگر کے مریض بن کر حاجی صاحب کی چائے سے تائب ہو گئے تھے۔حاجی صاحب مکس چائے پینے کے عادی تھے جس میں دودھ کے مقابلے' ڈبل چینی پتی ہوا کرتی جس کے بعد برابر کا کتھا چونا

چاروں تمبا کو اور قوام والا پان نوش جان کیا جاتا جب ایمبیسی کا سگریٹ سلگانے کے لئے انہیں ماچس دستیاب نہ ہوتی تو شامت پھر بے چارے منیر کی آتی جسے حاجی صاحب غلیظ گالی دے کر پکارتے اور اس کی برآمدگی پر پان کی پیک تھوک کر چینی کمانوں کی طرح گالیوں کا کورس مکمل کیا کرتے اور منیر کے ہاتھ سے ماچس جھپٹ کر سگریٹ سلگانے سے قبل پان کو جبڑے کے ایک طرف سے دوسری طرف گھماتے ہوئے ایک بار پھر پیک تھوکتے اور سگریٹ سلگا کر لمبا کش لے کر بھارت کے سابق کرکٹ کپتان بشن سنگھ بیدی کی طرح مست ہو جایا کرتے۔ ہم ایک نگاہ حاجی صاحب کے چہرے پر ڈالتے اور ایک ان کی تھوکی ہوئی پیک پر' ہمیں ایسا لگتا کہ حاجی صاحب نے گالیوں کی شکل میں اپنے اندر کی غلاظت زمین پر انڈیل کر خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا ہے۔

بارہا! ہم نے حاجی مستری کو اس خودکشی سے باز رکھنے کی کوشش کی وہ ہر بار ہماری نصیحت کا جواب اپنی خود ساختہ منطق سے دیا کرتے۔ ہماری گاڑی کا پوائنٹ دکھا کر کہتے ''یہ کیا ہے؟'' ۔''پوائنٹ ہے اور کیا ہے؟'' دوسرا ہاتھ ہوا میں لہرا کر پوچھتے ''اور یہ ریگ مال'' ۔''ہماری نصیحت کا ان دونوں سے کیا تعلق؟'' ۔''بہت گہرا! پروفیسر صاحب بہت گہرا تعلق ہے۔ یہ دیکھئے! جس طرح ریگ مال سے صفائی کے بعد آپ کی گاڑی کا پوائنٹ کرنٹ ٹھیک اور تیز دے گا بالکل اسی طرح کڑک چائے' قوام اور تمباکو والے پان اور تیز سگریٹ انسان کے اندر ریگ مال کا کام کرتے ہیں جس سے اندر کا کرنٹ تیز ہوتا ہے۔ جسم کے ساتھ دماغ بھی تیز چلنے لگتا ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں! جب بھی چائے کے بعد پان کھا کر میں نے آپ کی گاڑی کو ہاتھ لگایا ایک دم سالی کا نقص پکڑ لیا۔''

اس ساری گفتگو کے دوران ہماری بے بسی اور بے چینی دیدنی ہوتی۔ ہم خود کو اس پنچھی کی طرح محسوس کرتے جسے اس کی مرضی کے خلاف پنجرے میں قید کر لیا جائے اور وہ جلد از جلد رہائی کے لئے پھڑ پھڑانے لگے۔ کام کے دوران ہمیں اس وقت شدید کوفت ہوتی جب حاجی مستری کا مطلوبہ اوزار دستیاب نہ ہوتا۔ ''ابے او گھوڑے کہاں مر گیا۔ تیری تو فلانے کی ایسی تیسی'' ڈرا سہما منیر مجرم کی مانند حاجی صاحب کے حضور مطلوبہ اوزار پیش کر کے گالیوں کی پروا کئے بغیر پھر سے اپنے کام میں مشغول ہو جاتا۔ ''حاجی صاحب! آپ خواہ مخواہ گالیاں بک کر اپنی زبان گندی کرتے ہیں۔ منیر کا تو ان سے کچھ بگڑتا نہیں'' ''اجی پروفیسر صاحب! آپ کو پتہ نہیں یہ اس سالے کی خوراک ہے جب تک دو چار گالیاں نہ کھالے

سالے کا دماغ ٹھکانے نہیں آتا‘‘۔ ’’حاجی صاحب! برا نہ منانا مجھے تو یہ آپ کی عادتِ بد لگتی ہے۔‘‘ ’’چھوڑیں جی پروفیسر صاحب! آپ کن چکروں میں پڑ گئے۔ آپ کو کیا پتہ ہم نے استادوں کی کتنی گالیاں کھائی ہیں‘‘۔ ’’یعنی آپ کو احساس ہے کہ آپ کا استاد آپ کو ناحق گالیاں بکتا تھا‘‘۔ ’’اجی پروفیسر صاحب! آپ کو لگتی ہوں گی گالیاں' بادشاہو! یہ گالیاں تو دعاؤں کا کام کرتی ہیں جو استاد کی گالیاں نہیں کھائے گا۔ وہ خاک کاریگر بنے گا۔‘‘

کم علم آدمی سے بحث یا دلیل کے بجائے خاموشی بہتر ہوتی ہے۔ ہم بھی ایک طرح سے فرض ادا کر کے اپنی نظروں میں سرخرو ہو جاتے۔ حاجی مستری اور اس کے شاگرد کو ان کے حال پر چھوڑ کر دل ہی دل میں ان سے خلاصی کی دعائیں مانگنے لگتے جو کئی سالوں کی ریاضت کے بعد اسکالرشپ کی شکل میں قبولیت کی جانب گامزن تھیں۔

دو طبقے' زندگی میں رکھ رکھاؤ اور عزت' بے عزتی کے خوف سے قطعی ناآشنا ہوتے ہیں یعنی انتہائی امیر اور انتہائی غریب' درمیانے طبقے کو اس قسم کے تمام امراض لاحق ہوتے ہیں جن میں سے بیشتر کا مداوا ان کے بس میں نہیں ہوتا۔ اسکالرشپ کے ایک پروانے کے مقابلے' بہت سی مشکلیں سر کرنا دشوار نظر آتا تھا۔ ''لیلیٰ'' کی فروخت کے بغیر نہ حاجی مستری سے گلوخلاصی ہو سکتی تھی اور نہ زادِ راہ کا مسئلہ حل ہو سکتا تھا۔ بازار میں ہماری خرید کردہ رقم کا نصف بھی ملنا دشوار ہو رہا تھا۔ ہمیں اپنی ہی طرح اسٹیٹس کے مارے کسی پروفیسر کی تلاش تھی جو ہماری جگہ تبادلہ ہو کر آنے والے ہمارے ہم منصب نے پوری کر دی۔ بقیہ رقم بیگم نے زیورات بیچ کر مہیا کی۔ یوں بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا اور ہماری روانگی کے انتظامات مکمل ہو سکے۔ روایت کے مطابق الوداعی دعوتوں اور ملاقاتوں کا سلسلہ ایک ہفتے سے زیادہ جاری رہا۔

جہاز کی نرم اور آرام دہ سیٹ میں دھنستے ہی ہمیں شرمندگی کے احساس میں غرق ہونا پڑا۔ ہم اپنے دو محسنوں حاجی مستری اور لیلیٰ کے نئے مالک پروفیسر سے دانستہ مل کر نہ آئے تھے۔ ہمارے دل میں کہیں نہ کہیں یہ چور چھپا تھا کہ ان سے مل کر ہمارا کوئی نہ کوئی جرم ضرور ہمارے راستے کی رکاوٹ بنے گا اور ہم اپنے راستے کی تمام رکاوٹوں کو پیچھے چھوڑ کر آگے ہی آگے بڑھنا چاہتے تھے۔

انسان کی جاہ طلبی کے بہت سے قصے ہم نے سن اور پڑھ رکھے تھے۔ خود بیتی نے ہمیں اس کا مزید اس وقت قائل کیا جب تین سال کا تعلیمی عرصہ گزارنے کے بعد ہم نے وطن

واپسی کی بجائے دیارِ غیر کو اپنا مسکن بنایا۔ گئے ہم علم حاصل کرنے تھے گرویدہ وہاں کی معاشرت کے ہو گئے۔ بے شک! وطن عزیز کے مقابلے ان کی معاشرت، لین دین، رہائش، خوراک، ذریعہ تعلیم اور ذرائع نقل و حمل اور قانون کی حکمرانی قابلِ رشک ہے مگر ایک سادے اور سچے مشرقی خاندان کے سربراہ کے لئے یہ سب آسائشیں اس وقت اپنی اہمیت کھو بیٹھتی ہیں جب اس کی اولاد جوانی کی حدود میں داخل ہو کر ان سہولیات کا کسی قدر ناجائز فائدہ اٹھانے لگتی ہے۔ نورین، یاسر اور کاشف کی بڑھتی ہوئی عمروں اور مطالبوں کے پیش نظر ہم میاں بیوی کا متفقہ فیصلہ وطن واپسی تھا۔

دس سال میں عملی ترقی نہ ہونے کے باوجود وطنِ عزیز میں بہت کچھ تبدیل ہو چکا تھا۔ بڑی بڑی عمارتوں اور قیمتی گاڑیوں کے علاوہ شادی ہال، بیوٹی پارلر، کلب، تھیٹر اور شادی بیاہ کے رسوم و رواج نئی طرح پا چکے تھے۔ رخصتی کی نسبت ہماری آمد زیادہ پر جوش تھی۔ بہت سے گھروں میں رہن سہن اور طرزِ زندگی خاصا بدل چکا تھا اور بہت سوں میں پیسے کی ریل پیل پہلے کی نسبت کہیں زیادہ تھی۔

یورپ سے آتے وقت ہم اپنی لیفٹ ہینڈ ڈرائیو مرسیڈیز اس خیال سے ساتھ لے آئے تھے کہ رشتے داروں پر اچھا اثر پڑے گا مگر ہماری یہ خوش فہمی کئی گھروں میں کھڑی پیجارو اور لینڈ کروزر جیسی قیمتی گاڑیوں نے دور کر دی۔ بس ایک ہمارے بڑے سالے صاحب خدا معلوم کس قماش کے آدمی تھے کہ جنہیں ہم جس حال میں چھوڑ کر گئے تھے وہ ہمیں واپسی پر بھی اسی حال میں ملے گو کہ ان کی مالی حالت پہلے سے کسی قدر کمزور تھی مگر ان کے خلوص اور محبت میں بہت اضافہ ہو چکا تھا۔ کئی دن کی پر تکلف دعوتوں کے بعد ان کے گھر کی غریبانہ دعوت میں بہت اپنائیت اور محبت کا احساس ہو رہا تھا۔ یہ واحد دعوت تھی جو ہم نے دن کے وقت کھائی ورنہ اکثر دعوتیں رات گئے تک جاری رہتیں۔ سالے صاحب کے گھر میں جو خلوص و محبت ہمیں ملی اس کو ہمارے بچوں نے بھی شدت سے محسوس کیا اور ہم سب کا فارغ وقت ان ہی کے ساتھ گزرنے لگا۔ ہمیں اپنی مادر علمی میں جاب آفر ہو چکی تھی مگر ہم کچھ دن آرام کے موڈ میں تھے ہر روز شام کہیں نہ کہیں سیر و تفریح کا پروگرام ہوتا۔

پہلی بار ایسا ہوا کہ ہم تفریح پر گئے اور ہماری مرسیڈیز نے جھٹکے کھا کر خاموشی اختیار کر لی۔ ہم سدا سے اسٹیرنگ ڈرائیور تھے۔ ہماری سمجھ میں کیا آتا! سب لوگ گاڑی سے نیچے اتر کر قرب و جوار کا جائزہ لے رہے تھے۔ کچھ فاصلے پر ہمیں ایک چائے کا کھوکھا نظر آیا جس

کے مالک نے کچھ فاصلے پر ورکشاپ کی نشاندہی کی۔ مستری نوجوان بلکہ خوبصورت بھی تھا اگر وہ نہا دھو کر فیشن کے مطابق لباس زیب تن کر لیتا تو آج کل کے کسی فلمی ہیرو سے کم نہ تھا۔ اس کی توجہ گاڑی سے زیادہ ہم پر تھی۔ شام کا وقت اور مضافات کے باعث ہمارے دل میں برے برے خیالات سر ابھار رہے تھے۔ ہمیں یورپ کے وہ خوبصورت نوجوان یاد آ رہے تھے جنہیں دیکھ کر آپ کے دل میں شفقت پدری پیدا ہوتی ہے لیکن وہ نہایت بے دردی سے لُوٹ کر آپ کو جان سے مارنے کی دھمکی دیتے ہوئے غائب ہو جاتے ہیں۔ ''چھوٹے ابے او چھوٹے! چودہ کی چابی تو لا۔ ابے کہاں مر گیا۔'' چھوٹا سا معصوم سا آٹھ دس سال کا بچہ سیاہی میں لت پت ڈرا سہما استاد کے روبرو چابی لے کر حاضر ہوا۔

غلط سائز کی چابی لانے پر چھوٹے کے منہ پر زوردار طمانچہ اور ہمارے سر پر ہتھوڑے کی دھمک پڑی۔

ہمارا ذہن چکرا گیا گالی ہو بہو حاجی مستری والی تھی۔ ہم نے کچھ کہنا چاہا مگر الفاظ دستیاب نہ ہو سکے۔ جتنی دیر ہم ورکشاپ میں رہے مستری ہمیں اور ہم اسے غور سے دیکھتے رہے بلکہ واپسی پر بھی ہمارا دماغ اسی کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہے!!!

قرضِ حسنہ

''شکر ہے خدا کا! آپ نے بچا لیا۔ خدا معلوم اس پتھر سے پیر پھسلنے کے بعد میں کھائی کے کس کونے میں پڑی کراہ رہی ہوتی۔'' بیگم جہاں آرا وددو نے بیری کے جنگلی پودے کی ٹہنی میں پھنسی ریشمی ساڑھی کے پلّو کو ایک ہاتھ سے چھڑانے کی ناکام کوشش کی اور دوسرے ہاتھ سے اپنے شوہر عبدالودود صاحب کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے رکھا۔

''بیگم! کانونیٹ اور دیگر مشنری سکولوں میں پڑھنے کا ایک نقصان یہ ہے کہ انسان اپنی زبان اور روزمرہ کے محاوروں سے قطعی اجنبی ہو جاتا ہے۔ بھئی! میں کون ہوتا ہوں آپ کو بچانے والا؟ میں نے تو صرف آپ کو تھاما ہے۔ بچانے والی ذات' وہ اوپر (آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) جب چاہے' جس کو چاہے اور جیسے چاہے بچا لے اور جب چاہے مار دے۔ جس طرح اُس نے آپ کو میرے ہاتھوں کے ذریعے بچایا ہے چاہتا تو انہی ہاتھوں کے ذریعے آپ کی جان بھی لے سکتا تھا۔''

''اللہ! وڈودآپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔ آپ تو مجھ سے اتنی شدید محبت کرتے ہیں میری ذرا سی تکلیف پر بے چین ہو جاتے ہیں ویسے! ایک بیوی کی اس سے بڑی اور کیا خوش قسمتی ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے شوہر کی باہنوں میں جان دے۔

''جہاں آراء! اس وقت آپ بالکل فلمی ہیروئنوں کی مانند گفتگو کر رہی ہیں۔ میرا بھی دل چاہتا ہے کہ میں آج آپ پر ایک انکشاف کروں؟''

''وَدُود.................. (حیرت سے منہ پھاڑتے ہوئے) پینتیس سالہ رفاقت کے باوجود آپ نے ہم سے کچھ چھپایا ہوا ہے؟''

''ہاں، ہاں بھئی، ابھی بہت سے رازہائے سربستہ آپ پر منکشف ہونا باقی ہیں اگر آپ میری بات سن کر سنجیدہ رہنے کا وعدہ کریں تب!''

''چلیئے اب پی ٹی وی کے ڈراموں کی طرح سسپنس پیدا نہ کیجئے، ہم واقعی سنجیدہ ہیں۔''

''جہاں آرا! آپ کو علم ہے کہ سی ایس ایس کا امتحان دینے سے پہلے ہم پر فلمی ہیرو بننے کا بھوت سوار تھا اور ہم اکثر فلم سٹوڈیو کے چکر بھی کاٹا کرتے تھے۔ یقین کیجئے جس وقت آپ کا اس پتھر سے پیر پھسلا اور آپ کی چیخ پر جس بے ساختگی سے ہم نے آپ کو تھاما اُس وقت ہمیں فوری طور پر جوانی کے ایام یاد آ گئے۔ بس ایک کی عشقیہ فلمی گیت کی رہ گئی تھی (ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے) اس بڑھاپے میں یہ کتنا عجیب لگتا؟''

''رہنے بھی دیجئے! (وَدُود صاحب کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے) آپ اتنے بھی بوڑھے نہیں۔ آپ تو اب بھی سو فیصد ہیرو ہیں مگر ہالی وڈ کے، تریسٹھ برس کی عمر میں اس قدر مایوسی ہمیں اچھی نہیں لگتی۔

''بسم اللہ .... بسم اللہ .... میرے صاحب آئے ہیں (محمد بوٹا، تیز دھوپ اور چیکٹ لباس میں دور سے بھاگتا ہوا آیا تو وہ کسی پسماندہ افریقی قبیلے کا فرد لگ رہا تھا۔ پھولی ہوئی سانس کو درست کئے بغیر اس نے جھک کر دونوں ہاتھوں سے وَدُود صاحب کے پیروں کو چھونا چاہا) مالک چم چم کرتی لمبی گڈی کو دیکھتے ہی میں فوراً سمجھ گیا تھا، ہو نہ ہو! بڑے سرکار آئے ہیں۔''

وَدُود صاحب کو پیر چھونے کی فرسودہ رسم پر بڑا غصہ آیا۔ برہمی سے پیچھے ہٹتے ہوئے بولے۔

''دیکھو بھئی بوٹا! تم اچھی طرح جانتے ہو، میں اس قسم کی باتیں بالکل پسند نہیں کرتا۔ میرے نزدیک سب انسان برابر ہیں۔ لہذا تم جلدی سے سیدھے کھڑے ہو جاؤ اور اپنے گھر بار کی خیر خیریت سناؤ۔''

''سرکار! آپ ہمارے مالک ہیں، سر کے سائیں ہیں، اَن داتا ہیں ہمارے آپ کے پیر چھونا ہمارا فرض ہے (محمد بُوٹا نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی)

پھر سرکار! ہمیں اس میں سواد بھی بڑا آتا ہے۔''

''چھوڑو یار! (عبدالودود صاحب نے بے تکلفی سے بُوٹا کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے) کس فرسودہ زمانے کی بات کرتے ہو۔ یہ بتاؤ! تم کیسے نظر آرہے ہو یہاں' تمہارا بابا دکھائی نہیں دے رہا؟''

''صاحب جی! وہ .... بابا تو پچھلی گرمیوں میں فصل پکنے سے پہلے ہی اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔ اُس کے بعد سے میں ہی بابا کی جگہ ہوں۔''

''تم کام وام کیا کرتے ہو (بیگم جہاں آرا وُدود نے اپنے خوبصورت چشمے کے باہر دیکھتے ہوئے بات جاری رکھی) میرا مطلب ہے نوکری وغیرہ؟''

''مائی باپ! ہم کمی کمین لوگ ہیں' کئی نسلوں سے آپ کے خادم ہیں' ہماری نوکری اور ہمارا کام آپ لوگوں کی خدمت کرنا ہے۔''

''بھئی! گزراوقات کے لئے انسان کو کچھ تو ....''

''جہاں آرا بیگم .... جہاں آرا بیگم! یہ شہر نہیں گاؤں ہے۔ (عبدالودود صاحب نے اپنے لہجے میں نرماہٹ اور حلاوت شامل کرتے ہوئے) یہاں کے قاعدے قوانین اتنی جلد آپ کی سمجھ میں نہیں آئیں گے؟ آپ کو تو ٹھیک سے یاد نہیں کہ آپ ہماری پینتیس سالہ رفاقت میں کل کتنی بار گاؤں آئیں؟ ہاں تو بھئی بوٹا کیا خیال ہے چلا نہ جائے''

''سرکار! آپ حویلی نہیں گئے؟ چوہدری صاحب سے نہیں ملے؟''

''گئے تھے بھئی گئے تھے۔ چوہان صاحب کسی کام کے سلسلے میں شہر گئے ہوئے ہیں۔ اُن کے بچوں نے لسّی پانی کے لئے بہت زور مارا تھا مگر ہم سیدھے تمہاری طرف چلے آئے اگر چوہدری کی طرف رک جاتے تو وہاں سے اٹھنا محال تھا۔''

''دھوپ کی شدت کے باعث گرمی کافی زیادہ ہوگئی ہے۔ جلدی سے لاک کھولیں۔'' (بیگم جہاں آرا ودود نے بیش قیمت گاڑی کا دروازہ کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا)''

''بیگم صاحبہ! اب آپ ذرا پچھلی سیٹ پر استراحت فرمایئے' فرنٹ سیٹ پر میرے ساتھ بوٹا بیٹھے گا جس سے میں نے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ (وُدود صاحب نے گاڑی کے اگلے اور پچھلے دوراز ے کھولتے ہوئے محمد بوٹا کو فرنٹ سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا)''

''ہیں صاحب جی! (حیرانی سے) آپ کے ساتھ میں بیٹھوں؟''

''ہاں جی بونا جی! آ جایئے میں آپ کے ساتھ بیٹھ جاتا ہوں''

''صاحب جی! مجھے تو بڑی شرمندگی محسوس ہو رہی ہے'لوگ کیا کہیں گے مالکوں کی برابری پر اتر آیا ہے۔''

''دیکھو بھئی بوٹا! یہ آج کی بات تو ہے نہیں' تم مجھے بچپن سے جانتے ہو اور جب بھی ملتے ہو اسی طرح کی باتیں کرتے ہو' نہ پہلے تمہاری باتوں کا کوئی اثر ہوا ہے اور نہ اب ہونے والا ہے ......سناؤ تمہارے کتنے بچے ہیں اور گھر بار کہاں ہے؟''

''سرکار! بچے تو پانچ تھے (ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے) اب چار رہ گئے ہیں۔ بابا اپنے ہاتھوں سے بڑی بیٹی کا ویاہ جانو دھوبی کے پتر کالو سے کر گیا تھا۔ دو ماہ پہلے بچے کی تکلیف میں بیٹی تو اللہ کو پیاری ہوگئی پر اپنی پھول سی نشانی چھوڑ گئی ہے۔ صاحب جی! آپ ایک مہربانی کریں کسی طرح جانو دھوبی سے کہہ کر میری دھی کی نشانی مجھے دلا دیں۔ اسی طرح بیٹی کا دُکھ کچھ کم ہو جائے گا۔''

''کچھ کیجئے نا! بیچارہ کتنا دُکھی ہے (بیگم جہاں آرا وِدود نے وِدود صاحب کو مخاطب کر کے کہا)''

''اچھا دیکھتے ہیں ......تم اپنے بچوں کی بابت کچھ بتا رہے تھے۔''

''جی صاحب جی! اُس کے بعد دو بیٹے ہیں جی' دونوں چنگے سیانے ہیں جی' جان جُثّے کے ذرا کمزور ہیں میری طرح مگر کام دھندے کے بڑے شیر ہیں جی' بڑا تو جی چوہدری صاحب کے ڈیرے پر کام کرتا ہے اور چھوٹے کو میں نے جھورے ترکھان کی دُکان پہ ڈال دیا ہے۔ دیتا دلاتا تو جھورا کچھ نہیں ہے پر ہُنر تو سکھا رہا ہے جی' اب تو رندا بھی مار لیتا ہے میرا بیٹا صاب جی پر ابھی جھورے کے ہاتھ والی صفائی نہیں آئی اُس کے ہاتھ میں۔''

''اور بقیہ دو بچے؟''

''ہاں جی بچی ہے سات ایک ورے کی' آخری بچہ چھوٹا ہے ابھی ماں کا دودھ پیتا ہے۔''

''گھر بار کے بارے میں بتا رہے تھے تم کچھ؟''

''میں صاب جی! بابا والے پُرانے مکان میں رہتا ہوں جی۔''

'oh my God' وہی جہاں ہم بچپن میں بیریاں توڑا کرتے تھے؟ ......اور جہاں ابھی بیگم صاحبہ کی ساڑھی پھنس گئی تھی۔''

''ہاں جی' ہاں جی ......''

''یار وہ مکان تو بہت بوسیدہ ہے اور وہاں تو گندگی بھی بہت ہے۔رات بے رات جنگلی جانوروں کا خطرہ بھی رہتا ہوگا؟''

''یہ تو ہے صاب جی...... کیا کریں کوئی ٹھیا ٹھکانہ بھی تو نہیں' پھر ہمارا کام ہی ایسا ہے۔ چوویں گھنٹے موجود رہنا پڑتا ہے۔خدا معلوم کب کیا ہو جائے۔''

''لو بھئی محمد بُوٹا! تمہارا گاؤں آ گیا.......... میرا مطلب ہے ہمارا گاؤں آ گیا'' (پہلے بیگم صاحبہ اور پھر محمد بُوٹا کی سائیڈ کا دروازہ کھولتے ہوئے وُدود صاحب نے کہا)

''سرکار یہ تو چوپال والی تھاں آ گئے آپ' آپ تو مالک ہیں' سرکار ہیں۔آپ کی اپنی حویلی ہے بیگم صاحبہ کو وہاں لے چلئے۔انہیں آرام کی ضرورت ہو گی......لمبا سفر کٹ کے آئے ہیں جناب۔''

''ہماری فکر چھوڑ دو بُوٹا' ہم تمہارے صاحب کے ساتھ ہیں' جس طرح صاحب کہتے ہیں اسی طرح کرو۔''

''جو سرکار کا حکم! (اتنا کہہ کر محمد بوٹا چوپال پر پڑی بہت سی چارپائیوں میں سے ایک اٹھا لایا اور اسے درخت کے نیچے ڈال کر) سرکار! آپ یہاں تشریف رکھیں میں لسّی پانی کا بندوبست کرتا ہوں۔''

نہیں بوٹا! اس کی ضرورت نہیں (گاڑی سے تھرماس نکالتے ہوئے) سب کچھ ہے ہمارے پاس' تم ایسا کرو کہ پہلے چوہان صاحب پھر چوہدری صاحب اور پھر پٹواری صاحب کا باری باری پتا کرو تا کہ ان سے ملاقات کی جاسکے۔''

''فکر ای نہ کریں سرکار! میں ہن ای گیا تے ہن ای آیا۔''

☆

''خوش آمدید..........خوش آمدید.......... جی آیاں نوں.......... ست بسم اللہ...... میرے شہزادے آئے ہیں.......... ہو ہو' ہو ہو' ہو ہو...... بھابھی جان صاحبہ بھی تشریف لائے ہیں......سلام عرض کرتا ہوں بھابی صاحبہ (چوہدری حکم داد نے نہایت گرم جوشی سے عبدالودود صاحب کو گلے لگانے کے دوران بیگم جہاں آرا ودود کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے احترام سے ہاتھ اٹھایا)

''کیا حال ہے چوہدری صاحب.......... گھر بار' بال بچوں' کھیتی باڑی اور مال مویشی کیسے ہیں آپ کے؟''

''یہ کیا ظلم کر رہے ہیں آپ ...... یہ کیا ظلم کر رہے ہیں ...... میں تو خادم ہوں آپ کا ...... نیاز مند ہوں ...... آپ کا چھوٹا بھائی ہوں ...... آپ کے لئے چوہدری نہیں ہوں ...... آپ مجھے میرے نام سے بلائیں ...... حکم داد کہہ کر پکاریں ......''

''مہربانی ہے آپ کی .... میرے لئے تو میرے گاؤں کا ہر فرد میرا بھائی اور محترم ہے''

''جی ہاں .... جی ہاں (چوہدری حکم داد نے چہرے پر ناگواری کے تاثرات کے باوجود لجاجت کا اظہار کیا) پر حضور! مجھے آپ سے سخت گلہ ہے۔ میرا دولت کدہ ہوتے ہوئے آپ یہاں چوپال پر کیا کر رہے ہیں۔ اور آپ کا اپنا غریب خانہ بھی تو موجُود ہے۔''

''سرکار .... یہ دیکھئے .... آپ سے کون ملنے آیا ہے (ضعیف العمر کو لاٹھی سے پکڑ کے لاتے ہوئے بُوٹا نے دُور سے ہانک لگائی)''

''ارے .... رے رے .... اُستاد محترم .... اُستاد محترم! یہ مجھ سے کیا گستاخی سرزد ہوگئی (وڈُودصاحب چارپائی سے اٹھ کر تیزی سے ماسٹر جمعہ بخش کی جانب لپکے) میں خود قدم بوسی کے لئے حاضر ہوتا!''

''جب مجھے پتہ چلا میرا شہزادہ آیا ہوا ہے تو مجھ سے رہا نہ گیا (رعشہ زدہ ہاتھ وڈُودصاحب کے چہرے پر شفقت سے پھیرتے ہوئے' راز دارانہ لہجے میں) سنا ہے! میری شہزادی بھی آئی ہوئی ہے؟''

''جی .... جی .... ارے بھئی جہاں آرا جلدی سے آؤ! میرے اُستاد' میرے معمار' میرے مربی' میرے مہربان' میرے شفیق بزرگ خود چل کر ہم سے ملنے آئے ہیں۔''

''ارے کیا کرتے ہو بیٹا! ماں' بہو' بیٹی ہماری روایات میں ہمیشہ محترم رہی ہیں .... میں خود چل کر اُسے پیار دوں گا!''

''جہاں آرا! میں نے زندگی میں جو کچھ حاصل کیا وہ سب ماسٹر صاحب کی جوتیوں کا صدقہ اور انہی کی تربیت کے طفیل ہے۔''

''ارے نہیں نہیں بیٹا! (دُھندلے اور بوسیدہ چشمے کے پیچھے بہتے ہوئے آنسوؤں کو صافے کے پلو سے صاف کرتے ہوئے) کیوں گنہگار کرتے ہو .... میں کیا' میری تعلیم کیا؟ میں تو ادنیٰ خادم ہوں' اللہ تعالیٰ نے تمہیں بڑی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ یہ سب اُسی کا کرم ہے۔ یقین جانو ستاسی برس کی عمر میں بھی تمہیں دیکھ کر میں پھر سے جوان ہوگیا ہوں' لگتا ہے تمہاری شکل میں میری جوانی لوٹ آئی ہے۔''

''ماسٹر صاحب! آپ جنہیں دیکھ کر جوان ہو رہے ہیں (شرارت سے وڈ وو صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے) وہ تو خود کو بوڑھا کہتے نہیں تھکتے۔''

(بیگم کو اشارے سے منع کرتے ہوئے) 'ماسٹر صاحب آپ کھڑے کیوں ہیں تشریف رکھئے نا!''

''ہائے...... ہائے...... ہائے...... برادر بزرگ آپ نے یہ کیا ظلم کر دیا' میں تو کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہا (گاؤں والوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ لوگ کیا کہیں گے کہ جس نے مجھے اپنا گھر' بار' زمین' جائیداد سونپ کر مجھے عزت بخشی ہوئی ہے' اپنا گھر ہوتے ہوئے وہ یوں بے گھر بیٹھا ہے؟''

''ارے چوہان صاحب! آپ ناحق پریشان ہو رہے ہیں (آگے بڑھ کر چوہان صاحب سے گلے ملتے ہوئے) پورا گاؤں میرا گھر ہے...... یقین مانئے ایئر کنڈیشنڈ گھروں' دفتروں اور گاڑیوں میں بیٹھ کر جسم کے مسام بند ہو گئے ہیں' دماغ بوجھل اور دل اداس ہو گیا ہے۔''

''اچھا چھوڑیئے! سب سے پہلے یہ بتایئے' میرے شہزادوں' ظاہر وڈ وو اور باطن وڈ وو کا کیا حال ہے' آج کل کیا کر رہے ہیں؟''

بھئی بیگم! آپ بھی تو کچھ بولئے! اب تو آپ بھی اس گاؤں کی اہم فرد ہیں۔''

''ظاہر میاں شکاگو (امریکہ) میں ہیں۔ خیر سے دو بچوں کے باپ ہیں اور Software Engineer ہیں اور بھائی صاحب! باطن میاں خیر سے شادی کے بندھن میں بندھنے کے بعد ٹورنٹو (کینیڈا) چلے گئے ہیں۔ وہاں کی ایک فرم نے انہیں جاب آفر کی تھی۔''

''ماشاء اللہ...... ماشاء اللہ...... کس شعبے میں تعلیم حاصل کی ہے باطن میاں نے (ماسٹر جمعہ بخش نے صافے کے پلو کو پشت پر ڈالتے ہوئے دریافت کیا۔)

''Mass Communication کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے باطن میاں نے! پاکستان میں بھی بڑے تشہیری ادارے میں کام کرتے تھے۔''

''بھائی صاحب! بہت ہو گیا (چوہدری صاحب کھڑے ہوتے ہوئے) باقی باتیں اب ڈیرے پر چل کر ہوں گی۔ میں چلتے وقت کھانے پینے کا بندوبست کرنے کو کہہ آیا تھا۔''

''چوہدری صاحب...... میرا مطلب ہے بھائی حُکم داد آپ ہم لوگوں کو مہمان سمجھ کر ہرگز پریشان نہ ہوں' یوں سمجھیں کہ ہم لوگ اب پکّے پکّے آپ کے بیچ آ گئے ہیں۔''

''ہیں جی ! (حیرت سے) ماشاء اللہ.......... ماشاء اللہ' یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔''
''دھن بھاگ ہمارے اگر آپ یہاں آ جائیں تو ہمیں اور کیا چاہئے۔''
''بیٹا! یہ میں کیا سُن رہا ہوں (کان میں انگلی ڈال کر ہلاتے ہوئے) اگر یہ خبر سچ ہے تو یقین مانو میں یہی خوشخبری سننے کے لئے زندہ تھا۔''
''بھائی صاحب ! میری ایک التجا ہے (چوہان صاحب ہاتھ جوڑتے ہوئے) اگر باقی کی باتیں گھر چل کر ہو جائیں تو بچوں کا انتظار ختم ہو جائے گا۔ یقین کیجئے سب لوگ بڑی بے چینی سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''
''چوہان بھائی ایک شرط ہے! ہم اکیلے نہیں جائیں گے۔ ماسٹر صاحب' بھائی خُلم داد' دینو' فیقہ' بوٹا اور یہ پٹواری صاحب بھی آ گئے۔ سب ساتھ چلیں گے۔''
''سو بسم اللہ جی (سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے) سر آکھاں تے۔''

☆

''اور سنائیں پٹواری صاحب کیا حال چال ہے' کام دھندا کیسا چل رہا ہے۔''
سرکار! ہم تو آپ کی رعایا ہیں' آپ تو پٹواری صاحب کہہ کر نہ بلائیں۔ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے جب آپ ضلع خوشاب کے ڈپٹی کمشنر ہوا کرتے تھے تو آپ ہی کی مہربانی سے مجھے یہ نوکری ملی تھی اور میں تبھی سے آپ کا دیا کھا رہا ہوں۔''
''رحمت علی ! رازق اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ وہ جس کو چاہے نیکی کی توفیق بخشے۔ برخوردار عبدالوُدود نے نجانے کتنے حاجت مندوں کی حاجت روائی کی ہے۔ گاؤں کے کتنے نوجوانوں کو برسر روزگار کرایا ہے۔ خدا شاہد ہے کہ اس نے کبھی کسی کے جائز کام کو انکار نہیں کیا۔''
''ہٹو بھئی ہٹو.......... یار تھوڑا سا راستہ اس غریب کو بھی دے دو...... میں نے بھی اپنے صاحب سے ملنا ہے۔''
''آہا..........نورے میاں آئے ہیں.......... بھئی نور محمد یہ منہ دیکھے کی تعریف نہیں ہے (ہاتھ کا نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے دونوں بازو پھیلا کر نورے کی جانب گامزن) یقین کرو سرکاری ملازمت کے دوران بڑے بڑے شہروں میں تبادلہ ہوا ایک سے ایک ماہر حجام کے اُسترے کے نیچے آنے کا اتفاق ہوا مگر جو لطف تمہارے سامنے سر جھکانے میں آتا تھا وہ کہیں نہیں آیا۔''

''صاب جی! کیوں شرمندہ کرر ہے ہیں۔ میں تو بڑا عاجز اور پینڈو سا بندہ ہوں۔''

''ہیں ...... ہیں ......تمہارے لئے میں کب سے صاحب جی ہو گیا۔تم تو میرے جوہڑ اور چھپڑ کے زمانے کے یار ہو' تم تو مجھے وڈو دا وئے .... وڈود ...... اور پھر ...... وڈود بھائی کہا کرتے تھے؟''

''اوہ جی کیا عرض کروں وڈود بھائی صاب! اپنی پستی اور آپ کی بلندی کے باعث زبان آپ کا نام لینے سے شرماتی ہے۔''

''یار چھوڑو! بلندی اور پستی' انسان سب برابر ہوتے ہیں۔ یہ بتاؤ ہماری تکون کا وہ تیسرا کونہ محمد حسین پوسٹ مین کیوں نہیں آیا؟''

''ہائے ہائے صاب جی .... کیا غضب کر دیا آپ نے .... کس کی یاد دلا دی۔''

''سب خیریت تو ہے؟ (دائیں ہاتھ سے توڑا ہوا نوالہ چنگیری میں رکھتے ہوئے اور بائیں ہاتھ سے نظر کا چشمہ اُتارتے ہوئے) خدانخواستہ .... محمد حسین ٹھیک تو ہے نا۔''

''کمال ہے! (چوہدری حکم داد نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے) چوہان صاحب نے آپ کو محمد حسین کی فوتگی کی اطلاع نہیں دی۔اس بیچارے کو تو سال سے اوپر ہو چلا ہے۔''

''چوہان بھائی! آپ اس دوران کئی مرتبہ شہر آئے اور آپ نے میرے عزیز دوست کی موت سے مطلع نہیں کیا۔''

''بس بھائی صاحب! کیا عرض کروں۔ چار' چھ مہینے بعد شہر کا پھیرا ہوتا ہے اس دوران گاؤں میں کئی موت فوت ہوتی ہیں۔کوئی بات ذہن میں نہیں بھی آتی۔''

''او ہو ہو .... بڑے دکھ کی بات ہے .... مجھے پہلی فرصت میں اس کے گھر جانا چاہئے ....اور اپنے امام صاحب کا کیا حال ہے اُن کی صحت بھی ٹھیک نہیں رہتی تھی۔''

''مولوی صاب ٹھیک ہیں سرکار (جھورے ترکھان نے دائیں بائیں والوں کو مونڈھے سے پیچھے کرتے ہوئے) اب جی وہ امامت نہیں کراتے امام صاحب کی جگہ اُن کا بڑا بیٹا شفاعت حسین پیش امام بن گیا ہے۔ بڑی سوہنی قرآت پڑھتا ہے جی۔ بندہ کا کلیجہ باہر آنے لگتا ہے۔''

''اور بھئی اپنے حکیم صالح محمد صاحب کا کیا حال ہے؟''

''میں ٹھیک ہوں سرکار! (مجمع چیر کر آگے بڑھتے ہوئے اُونچی آواز میں)''

''حکیم صاحب! آپ یہاں موجود ہوتے ہوئے نظر تک نہ آئے۔''

''حضور! (محمد بُوٹا نے حکیم صاحب کو ہاتھ سے پکڑ کر آگے لاتے ہوئے) حکیم جی کی نظر ختم ہو گئی ہے۔''

''بسم اللہ .... بسم اللہ .... (ماسٹر جمعہ بخش نے کھڑے ہو کر) حکیم صاحب آپ یہاں میرے ساتھ بیٹھیں''

''حکیم صاحب! آپ تو بڑے مانے ہوئے حکیم ہیں۔ آپ کے پاس تو دس دس' بیس بیس کوس سے چل کر مریض آتے تھے پھر یہ چراغ تلے اندھیرا کیوں؟''

''بس سرکار! سب نصیبوں کا کھیل ہے۔ جتنا نصیب میں لکھا تھا اُتنا دنیا کو دیکھ لیا۔ شہر میں آنکھوں کے ہسپتال میں بھی دکھایا وہ کہتے ہیں کہ پیچھے روشنی ختم ہو گئی ہے اس لئے آپریشن کرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔''

''وَدُود! میرا خیال ہے کہ آپ سب لوگوں کی موجودگی کا فائدہ اٹھا کر گاؤں آنے کا مقصد بیان کریں۔''

''بسم اللہ .... بسم اللہ .... وَدُود صاحب آپ کھل کر فرمائیں۔ ہم ہر طرح سے حاضر ہیں۔ (چوہدری حکم داد نے فخر سے سینہ پھلا کر کہا۔)''

''ہاں ہاں .... بھائی صاحب (چوہان صاحب نے تقریباً کھڑے ہو کر) چوپال میں آپ اس سلسلے میں کچھ فرما رہے تھے۔''

''بھئی میرا خیال ہے کہ بول بول کر کافی تھک گیا ہوں اور جو فیصلہ میں نے کیا ہے اُس میں مجھ سے زیادہ جہاں آرا کی قربانی کو دخل ہے لہٰذا ہمارے آنے کا مقصد اگر جہاں آرا بیان کریں تو زیادہ بہتر ہے۔''

''ہمارے گھر کا مالی رزّاق بڑا محنتی اور جفاکش ہے۔ آپ نے تو دیکھا ہے (چوہان صاحب' چوہدری صاحب اور ماسٹر صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اُس نے ہمارے گھر کو خوبصورت' سرسبز اور شاداب بنا رکھا ہے۔ ایک دن میں اور وَدُود صاحب لان میں اُداس بیٹھے تھے کہ رزّاق پھولوں کا خوبصورت گلدستہ بنا کر لایا اور بڑے احترام سے مجھے پیش کرنے لگا۔ اُس وقت میں اپنے بچوں کی جُدائی بلکہ بے وفائی پر اتنی دلگرفتہ تھی کہ میں نے رزّاق کو تقریباً جھڑکتے ہوئے کہا .... جن پر ہمارا اور جن کا ان پھولوں پر حق تھا جب وہ نہیں ہیں تو میں ان پھولوں کا کیا کروں۔ یکا یک میرا جواب سن کر رزّاق کا چہرہ باسی پھولوں کی مانند سوگوار ہو گیا۔ وَدُود صاحب نے صورتحال کو سنبھالتے ہوئے رزّاق سے کہا .... بھئی بیگم

صاحبہ کا مطلب ہے ان پھولوں پر تمہارا بھی اُتنا ہی حق ہے جتنا کہ ہمارا لہذا! یہ تم اپنے بچوں کے لئے لے جاؤ۔ رزّاق کے جانے کے بعد ہم دونوں میاں بیوی میں کافی بحث ومباحثہ رہا۔ وُدود صاحب بچوں کے حق میں اور میں خلاف دلائل دے رہی تھی۔ میرا کہنا تھا کہ ہم نے اپنے بچوں کو کتنی مشکل اور جانفشانی سے پالا' پوسا' پڑھایا' لکھایا' اچھی تربیت کی اُن کی بیاہ شادی کی اُن کی ضرورت کے لئے آسائش کی ہر چیز مہیا کی اور جب ہمیں اُن کی ضرورت محسوس ہوئی تو وہ بھولے بسرے پرندوں کی مانند اپنی اپنی منزل کی جانب روانہ ہو چکے تھے۔ میرا استدلال یہ تھا کہ ہمارے بچوں پر بلکہ تمام ماں باپ پر اپنی اولاد کا جو حق بلکہ قرض بنتا ہے اُس کی ادائیگی کا ہر اولاد کو خیال رکھنا چاہئے۔ یکا یک عبدالوُدود صاحب نے ایک ایسا جملہ کہا کہ میں حیران رہ گئی۔''

''دیکھئے نا! بات صاف ہے (وُدود صاحب نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے) میرے پردادا اللہ وسایا ایک معمولی کسان تھے۔ ڈیڑھ بیگا اراضی میں ہل جوت کر انہوں نے نہ صرف پورے خاندان کو پالا بلکہ میرے دادا مولوی خوشی محمد کو دارالعلوم حقانیہ سے فارغ التحصیل کرا کر علم کی روشنی سے آشنا کیا۔ وہی گھرانہ جو چوہدریوں کے سامنے سر اُٹھا کر نہ چل سکتا تھا (چوہدری حکم داد کی جانب کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے جو بیزاری سے پہلو بدل رہا تھا) اُسی خاندان کے فرد کی اقتدا میں وہی لوگ نماز پڑھنے لگے۔ میرے دادا مولوی خوشی محمد نے اپنے والد اللہ وسایا کی روشن کی ہوئی علم کی شمع کو نہ صرف گاؤں کے بچوں کو کلام پاک پڑھا کر پورے علاقے میں علم پھیلایا بلکہ میرے والد ماسٹر غلام رسول کو دینی اور دنیاوی تعلیم دلا کر مدرس بنا دیا۔ میرے دادا کی روشن کردہ شمع کو میرے والد نے نہ صرف پورے علاقے میں پھیلایا بلکہ مجھے اعلیٰ تعلیم دلوا کر میری زندگی کے راستے روشن کئے مگر میں اپنے خاندان کی اس روشنی کو اُس طرح نہ پھیلا سکا جس طرح میرا فرض بنتا تھا۔ میرے بزرگوں نے اپنے بزرگوں کی عطا کردہ روشنی کو نہ صرف لوگوں تک پھیلایا بلکہ زندگی کی آخری سانس تک اُن کی خدمت میں گزار کے (بقول جہاں آرا بیگم) حق اور فرض کی عمدہ طریقے پر ادائیگی کی۔ لہذا ہماری بحث کے دوران یہ سوال میری زبان پر آنا فطری امر تھا اگر ہماری اولاد نے ہمارے حق اور قرض کا خیال نہیں رکھا تو ہم نے کون سا اپنے بزرگوں کے حقوق صحیح طور پر ادا کئے ہیں ......اُسی لمحے ہم دونوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ ہم اس کوتاہی کی تلافی ضرور کریں گے اور زندگی کے بقیہ ایام اپنی زمین اور اپنے لوگوں کی خدمت میں گزاریں گے۔''

''تو کیا آپ مکمل طور پر گاؤں آ گئے ہیں (چوہدری حُکم داد نے اپنی پریشانی کو چھپاتے ہوئے) آپ کے شہر والے گھر کا کیا ہوگا وہ تو بڑا قیمتی اور موقعے والا ہے۔

''موقعے والا ہے تو آسانی سے فروخت بھی ہوسکتا ہے۔''

''اوہ! بھائی صاحب کی یہ گاؤں کی حویلی کم عالیشان ہے (چوہان صاحب نے خوشی سے ہاتھوں کو نچاتے ہوئے) اور بھابی جان کے یہاں آنے سے تو اُسے اور چار چاند لگ جائیں گے ...... آپ فکر نہ کریں بھائی صاحب ہم لوگ کل ہی اپنا کوئی ٹھیا ٹھکانہ کرلیں گے اور میں آج رات ہی سُکھیا کو کہہ آؤں گا وہ کل سے بندے لا کر چونا سفیدی شروع کردے گا۔''

''نہیں چوہان صاحب! آپ کہیں نہیں جارہے ہیں ہم اپنا گھر بنائیں گے اور اپنوں کے بیچ بنائیں گے ہمارا نیا گھر ہمارے شہر والے گھر سے زیادہ خوبصورت' سرسبز اور شاداب ہوگا۔''

''صاب جی! نواں سکول بنانے کا پروگرام ہے کیا؟''

''نہیں بھئی بوٹا! سکول نیا کیوں بنائیں گے پہلے سے موجود سکول کو بہتر کریں گے۔''

''جھلئے آ! صاب عبدالوۂ ود صاب کوئی چھوٹے موٹے بندے نہیں ہیں جو سکول وسکول بنائیں گے۔ یہ کوئی فیکٹری شیکٹری لگائیں گے وڈی ساری؟''

''میرے خیال میں تو برخوردار وۂ ود کا رُجحان ہسپتال کی جانب نظر آتا ہے نُور محمد''

''آپ کا خیال بھی غلط ہے ماسٹر صاحب! اللہ نے چاہا ہسپتال نہ سہی تو ڈسپنسری ضرور بن جائے گی مگر ہمارے آنے کا یہ مقصد ہرگز نہیں۔ ہم تو ماضی کی کوتاہیوں کا ازالہ کرنے کے لئے یہاں آئے ہیں''

''تو کیا (اشتیاق سے چوہدری حکم داد کا منہ کھلا) کھیتی باڑی کا ارادہ ہے جی؟''

''یار محمد بُوٹا! تم بہت دیر سے خاموش کھڑے ہو شائد تمہیں گھر یاد آرہا ہے؟''

''نہیں صاب جی ...... ایسی تو کوئی بات نہیں۔''

''پر یار! ہمارا تو دل چاہ رہا ہے تمہارے گھر جانے کے لئے ...... کیوں چوہان صاحب چلا نہ جائے محمد بُوٹا کے گھر؟''

''جیسے آپ کی مرضی بھائی صاحب'' (حیران ہوتے ہوئے)

''ماسٹر صاحب اور چوہدری صاحب' میری خواہش ہے کہ آپ بھی بلکہ سبھی لوگ ہمارے ساتھ محمد بُوٹا کے گھر چلیں''

''اچھا جناب (بیزاری سے کھڑے ہوتے ہوئے) جس طرح آپ کی مرضی' چلے چلتے ہیں۔

☆

''چوہدری صاحب! کتنا رقبہ ہو گا کُل یہاں کا؟''

''بُوٹے کے گھر کا جی ....؟''

''نہیں نہیں ....میرا مطلب قبرستان کے رقبے سے ہے''

''یہ جی ....کوئی (چاروں طرف حیرانی و پریشانی کے ملے جُلے تاثرات سے ہاتھ نچا کر دیکھتے ہوئے) ایک کلہ جگہ ہونی چاہئے ....ہوسکتا ہے کچھ کم بڑھتی بھی ہو جائے''

''ہوں ....کیا قیمت ہونا چاہئے اس کی ....؟''

''ہیں جی ....توبہ توبہ ....کیسی باتیں کر رہے ہیں بندہ پرور..........''

''آپ سب میرے بزرگ ....دوست اور عزیز ہیں ....ہوسکتا ہے میری بات وقتی طور پر آپ کو عجیب لگے مگر میں' اپنا شہر والا گھر بیچ کر اس قبرستان کی زمین کی قیمت ادا کرنا چاہتا ہوں جس کے بعد میں اس کے ایک گوشے میں رہائش اختیار کر کے اِس قبرستان کو بھی انسانوں کی بستی میں تبدیل کرنا چاہتا ہوں جو صاف ستھرا بھی ہو ......سرسبز شاداب بھی ....پُرامن اور پُرسکون بھی .... جہاں کھلنے والے پھول بے مصرف نہ ہوں ....شائد .... اِس سے اُس قرض کا کچھ حصّہ ادا ہو سکے جو میں یہاں مدفون اپنے بزرگوں کی زندگی میں ادا کرنے سے قاصر رہا.......... بالآخر یہ بستی انسانوں کی ہے اور اس میں بسنے والے بھی انسان ہی ہیں .... ہم سے بہتر' برتر اور عظیم انسان ...... بھلے ہی خاموش..........ہیں تو انسان! ....کتنا لُطف ہے اُس قرض کی ادائیگی میں جو بن مانگے ادا کیا جائے..........بھلے ہی بے وقت کیوں نہ ہو!!!

☆☆☆

اِچھّا دھاری ناگ

حافظہ کو ٹٹولنے‘ کھنگالنے کے باوجود بھی اُستاد کا نام اُبھر کر نہیں آتا۔ خیالات کا دھارا‘ گدلے پانی کی مانند‘ کثافت پیدا کر کے ذہنی اُفق کو اور دھندلا دیتا ہے۔ اُستاد کا ذکر کہاں سے شروع کریں! جب سے یادداشت پیروں ٹھمکنا شروع ہوئی تب سے اُستاد کا نام‘ ہماری یادوں سے نتھی ہو گیا۔ بچہ‘ بڑا‘ بوڑھا‘ جوان‘ عورت‘ مرد‘ محرم‘ نامحرم حتیٰ کہ علاقہ کا اکلوتا ہیجڑا‘ حمیدا بھی اُستاد کو‘ اُستاد کہہ کر ہی پکارتا تھا۔ نہ اُستاد کو اضافی آداب والقاب کی ضرورت تھی نہ وہ مخاطب کے مراتب کا خیال کرتے تھے۔ کوئی کہیں سے آیا ہے‘ کیسا ہی حیثیت والا ہے‘ اُستاد کی تیوری کے بل‘ مجال ہے رتی بھر اپنی جگہ سے جنبش کر جائیں! کالی‘ پیلی‘ کھٹی بتیسی میں دبی ادھ جلی بیڑی کا گل ہمیشہ‘ آنے والے سے پہلے اُستاد کی توجہ حاصل کرتا۔ بعد میں اُستاد‘ آنے والے کے سلام کا رُکھائی سے جواب دے کر‘ اپنے کام میں‘ گُم ہو جاتے۔

پیشے کے اعتبار سے اُستاد‘ نَے بچے ساز تھے۔ نئے نَے بچے بنانے کے ساتھ پرانے نَے چوں کی مرمت اور صفائی بھی کیا کرتے تھے۔ اسی سے اُستاد کا حلوہ مانڈا اور گھریلو اخراجات پورے ہوا کرتے تھے۔ دکان داری کے علاوہ کئی طرح کا کارِ خیر بھی اُستاد کی مصروفیات میں شامل تھا۔ مثلاً اُستاد اپنے وقت کے نامی گرامی پہلوان تھے۔ اپنی زندگی میں اُستاد نے کبھی کوئی دنگل ہارا نہ تھا۔ اُستاد نے کبھی کوئی کشتی تین منٹ سے زیادہ نہ لڑی تھی۔ پلک جھپکنے سے پہلے‘ جھکائی دے کر مخالف کے پٹّے سُونتنا اور چھاتی پر چڑھ بیٹھنا‘ اُستاد کا مشہور داؤ تھا۔ قینچی بھی اُستاد غضب کی لگایا کرتے تھے۔ دھوبی

پٹرے کے بعد تو اپنے حریف کی ایسی سٹی گم کرتے کہ اُس کی سمجھ میں نہ آتا کہ کب وہ اکھاڑے میں اُترا' کب اُستاد سے ہاتھ ملایا' کب اُستاد نے پٹے سُوت کر اُسے چاروں شانے چت کر ڈالا!

گو اُستاد کو اکھاڑا چھوڑے ایک زمانہ گذر گیا تھا پھر بھی اُن کی اُستادی کی دھوم قائم و دائم تھی۔ نوعمر اور نوخیز پٹھے' اُستاد کی مہارت اور تجربہ کے زور پر اب بھی میدان مار رہے تھے اور اُستاد کے نام کے جھنڈے گاڑ رہے تھے۔ اُستاد کے ٹھیئے پر گاہک سے زیادہ نوعمر و نوآموز پہلوانوں کا جھمگٹا دکھائی دیتا تھا۔ ہر وقت دنگل' کُشتی' زور' سانس ایک دوسرے کے ڈنڈ بیٹھک کی تعداد' چھاتی کی چوڑائی' ران کی موٹائی' بازو کی گولائی' بازو پھُلانے کے بعد اُبھرنے والے گومڑے کی پھڑ پھڑاہٹ کے علاوہ ''ہریا'' کی دکان سے ایک ہی سانس میں زیادہ سے زیادہ دودھ پینے اور مکّا مار کر گلگو توڑنے کے مقابلے پر زوردار بحث و تمحیث ہوا کرتی۔ آخری فیصلہ اُستاد کی رائے پر ہوا کرتا۔ کبھی کبھی' اُستاد کی ڈانٹ پر ساری بحث ہی ختم ہو جاتی۔

تازہ دم پہلوانوں کی منڈلی کو اُستادانہ داؤ پیچ بتانے کے ساتھ' اُستاد! ہڈی' گڈی کے ماہر بھی مانے جاتے تھے۔ منٹوں میں جوڑ سے جوڑ ملا کر نس سے نس اُتار کر' اُترا ہوا ٹخنا چڑھا کر' چیختے دھاڑتے آدمی کو ٹاٹا کر دیا کرتے تھے۔ بہت سے لوگ اُستاد سے ناف ملوانے بھی آیا کرتے تھے۔ ناف ملنے کا کام اُستاد صبح سویرے کرتے تھے۔ بعد از فجر چادر بچھا کر بیٹھ جاتے اور ہر آنے والے سے' اُس کے نہار منھ ہونے کا دریافت کرتے۔ ناف چڑھانے کے بعد چڈّھے حلوائی سے' پوری حلوہ کھانے کی تاکید کیا کرتے تھے۔ کہتے ہیں! اُستاد کی حکمت کے باعث چڈّھے حلوائی کا کاروبار خاصا چمک گیا تھا۔ احساسِ تشکّر کے باعث چڈّھا' اُستاد اور اُن کے مہمانوں کی تواضع' حلوہ پوری اور مٹھائی وغیرہ سے مفت کیا کرتا تھا۔ اُستاد جب بھی کسی کام کے سلسلے میں چڈّھے کو ہانک لگاتے ''جی اُستاد'' کہہ کر چڈّھا اس طرح دوڑا آتا جیسے چابی کا گڈا ہو!

سات سال سے چودہ سال کے بچوں کا رش بھی اُستاد کے ہاں دیکھنے والا ہوا کرتا تھا۔ یہ رونق جمعرات کے جمعرات لگا کرتی تھی۔ اُس روز' اُستاد بچوں کو ''منہ آنے'' کی دوائی کی پُڑیاں مفت تقسیم کیا کرتے تھے اور پیلیئے والے بچوں کو مفت گنڈا بنا کر' اپنے ہاتھ سے اُن کے گلے میں پہناتے تھے۔ پہلے آؤ پہلے پاؤ کا اُستاد کے ہاں قطعی رواج نہ تھا۔ جس کو من بھاتا' آواز کے ساتھ اشارے اور چٹکی بجا کر بلاتے....... ''آبے آ' تو آ گے آ....... ابے تجھے نیں' وہ تیرے پیچھے' بچّو کھڑا اے وِس کو بلا ریا اُوں....... دیکھ تو سی' سالے کا رنگ کیسا لال بوکا ور یا اے....... ابے کون سی چکّی کا کاوے اے....... سالے روج بہ روج پُول کے کُپّا اور یا اے.......!'' فجّی نائی کے لونڈے کے کولھوں پر دھپ مارتے ہوئے اُستاد ٹھٹول کرتے اور اپنا کام بھی جاری رکھتے.......

اُستاد کا ٹھیا کھُلتا اپنے وقت پر تھا' بند ہونے کا کوئی وقت مقرر نہ تھا۔ چیلے چانٹوں کی منڈلی جب تک جمی رہتی اُستاد بھی دانتوں میں بیڑی دبائے چہکتے رہتے۔ کبھی کبھی اُستانی کا اصرار بڑھ جاتا تو اُستاد کو گھر بھی جانا پڑتا وگرنہ دو' دروں والی دکان کے پچھلے در کا دروازہ بند کر کے جب جی چاہتا سو رہتے جب جی چاہتا جاگ پڑتے۔ پچھلے در کا کواڑ بند ہونے کی صورت میں کسی کی مجال نہ تھی جو اُستاد کو نیند سے جگائے یا اُستاد کے آرام وتخلیئے میں دخل دے۔

اُستانی کے ذکر پر آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ مراد اُستاد کی بیگم سے ہے۔ شروع شروع میں اُستاد کی عدم توجہ' اُنہیں بہت کھلتی تھی۔ آہستہ آہستہ' اُستانی تو اس رویہ کی عادی ہو گئیں۔ بچے اکثر ماں سے سوال کرتے' اُن کا باپ' گھر کیوں نہیں آتا۔ راتوں کو دکان پر کیوں سو رہتا ہے۔ بچوں کے چُبھتے سوالوں اور پاس پڑوس کی چہ میگوئیوں سے اُستانی جب اُک جاتیں تو اُستاد کی پسند کا زعفرانی پلاؤ اور نرگسی کوفتے پکا کر' اُستاد کو بلا بھیجتیں تب جا کر اپنے ہی گھر مہمان بن کر جاتے' ساتھ میں کوئی منہ چڑھا بھی لے جاتے اور بیگم کے بنائے نرگسی کوفتوں اور زعفرانی پلاؤ کو آستینے چڑھا کر خود بھی کھاتے اور اپنے لگے سگے کو بھی زور دے دے کر ناک تک ٹھساتے بھلے ہی بیوی اور بچوں کے لئے کچھ بچے یا نہ بچے!

یوں تو اُستاد سارے چیلے چانٹوں سے ایک سی محبت کیا کرتے تھے۔ کھلاتے سب کو سونے کا نوالہ اور دیکھتے قصائی کی نظر سے تھے۔ البتہ! ایک نہ ایک پٹھا ہر دور میں اُستاد کا منہ چڑھا ہوا کرتا تھا جسے اُستاد' داؤ پیچ سکھانے کے علاوہ خصوصی طور پر اکھاڑے لے کر جاتے اور صبح وشام اکھاڑے کی منڈیر پر بیٹھ کر داؤ پیچ سکھاتے اور زور کرانے والوں پر کڑی نگاہ رکھا کرتے تھے۔ اکھاڑے سے واپسی پر' ٹھنڈائی' دودھ جلیبی' حلوہ پوری' مٹھائی یا پستہ والی قلفی کا انتظام والنصرام بھی اُستاد کے ذمہ ہوتا تھا۔ ایک طرح سے اُستاد کا یہ منظورِ نظر پٹھا دیگر تمام پٹھوں کا سردار ہوا کرتا تھا۔ تمام نوخیز پٹھے اُستاد کے اِس چہیتے کی خوشنودی حاصل کرنے میں لگے رہتے تھے۔ یہ بانکا سجیلا' جسے اپنا یارِ غار بنا لیتا سمجھو اُس کی چاندی ہو جاتی!

فجی نائی کے بیٹے پر اُستاد کی مہربانیاں' زیادہ پرانی بات نہیں۔ کئی دنوں بلکہ ہفتوں سے دونوں اکٹھے دیکھے جا رہے تھے۔ کبھی کبھی دنگل اور اکھاڑے سے فرصت ملتی تو اُستاد' بندو کو' تھیٹر اور بائیسکوپ دکھانے بھی لے جاتے۔ محرم کے تاشوں اور جنم اشٹمی پر ساری ساری رات' بندو استاد کے ساتھ گھوما کرتا۔ جب رات زیادہ گذر جاتی تو وہ ماں کے ڈر سے گھر نہیں جاتا اور اُستاد کی دکان پر ہی سو رہتا۔ ایک بار جاڑے کی سرد رات میں بندو کی ماں نے اُسے گھر سے باہر کھڑا رکھا تھا جس کے بعد تین دن تک بندو بخار میں بھُنتا رہا تھا۔ بیوہ ماں خود کو کوستے نہ تھکتی تھی۔ فجی کی موت کے بعد بندو ہی

اُس کا واحد سہارا تھا جسے وہ اس اُمید پر پال رہی تھی کہ بڑا ہو کر بندو باپ کی دکان سنبھالے گا اور گھر کی ذمہ داریوں کے ساتھ بہنوں کے ہاتھ بھی پیلے کرنے کا وسیلہ بنے گا۔

☆

خبر کئی دنوں سے گردش میں تھی۔ ہر بار اُستاد کے اُدھڑے چہرے پر اس خبر کے سنتے ہی حریصانہ چمک نمودار ہوتی تھی۔ آج تو گلشن نے دھما کہ ہی کر دیا۔ منشی سخاوت علی کا لحاظ نہ ہوتا تو اُستاد نے بیچ و بچ چھوڑ، قیمتی سے قیمتی حقہ پٹک کر بھی چمپت ہو جاتے۔ منشی سخاوت علی کا شروع سے یہ وتیرہ تھا جب بھی اُنھیں اپنے حقہ کا نئے چا بنوانا ہوتا پہلے اُستاد سے پوچھنے آتے۔ ''اُستاد فارغ کس وقت ہو گے۔'' ''میاں فارگ وارگ کی بی کوب کو' او' منسی جی جس وکت تمارا جی چاوے آجئیو تماری اپنی دکان اے۔ میاں! ام تو کا دم ایں تمارے۔''

منشی سخاوت علی پڑھے لکھے خاندانی آدمی تھے۔ رکھ رکھاؤ میں خاندانی وقار کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ اُن کے خیال میں انسان کا رہن سہن اور استعمال کی اشیا سے ہی اُس کے خاندانی پن کا پتا چلتا ہے۔ بال بال قرضے میں بند ھنے اور خاندانی جائداد گروی ہونے کے باوجود منشی سخاوت علی ہمیشہ کی مانند اب بھی دو گھوڑے مارکہ بوسکی کا شیروانی کالر کُرتا' چابی مارکہ لٹھے کا علی گڑھ کٹ پاجاما اور سر پر رامپوری مخمل کی کالی ٹوپی کے علاوہ پیروں میں عراق کی بنی ہوئی کالی پمپی پہن کر' بازار سے جب بھی چیڑ میڑ کرتے گذرتے تو مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں پر بھی اُن کی خاندانی وجاہت کا بڑا رعب پڑتا۔ منشی سخاوت علی کے پاس اپنے اجداد کی نشانی چاندی کا نقشین حُقہ اب بھی موجود تھا جس کا نئے چا بنوانے گاہ بہ گاہ وہ اُستاد کے پاس آیا کرتے تھے۔ نیلے' پیلے یا سرخ رنگ کے دھاگے کے بجائے کالے رنگ کا ریشمی دھاگہ اور چاندی کے تار سے حُقے کا نئے چا بندھواتے۔ کام کے دوران نہ جانے کتنی بار اُستاد کو نفاست کی تاکید کرنا نہ بھولتے اور اُستاد کو خوش رکھنے کے لئے اُن کی جوانی کے قصے یاد کر کے اُستاد کو داد دیتے رہتے اور کام کی نگرانی کرتے رہتے تھے۔ اس طرح اُستاد کے ہاتھ تیز اور زبان آہستہ چلتی تھی۔

☆

گلی تنگ اور بد بودار تھی۔ جگہ جگہ سے کھڑنجے کی اینٹیں اُکھڑی ہوئی تھیں۔ بہت سے گھروں سے بہنے والے پرنالوں کا ٹین گل سڑ گیا تھا۔ دیواروں پر میل اور کاہی کی آڑی ترچھی تہیں جمنے کے ساتھ گندے پانی کے چھینٹے' راہ گیروں پر پڑا کرتے تھے۔ بہت سے گھروں کا رنگ و روغن اُڑ چکا تھا۔ بہت سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھے۔ کچھ گھروں کی دیواریں چیخ چیخ کر چونا طلب کر رہی تھیں۔ کچھ کی دیواروں میں لگی اینٹیں طبعی عمر سے گذر کر پاؤ' آدھ یا پونی گھِس' بکھر چکی تھیں اس کے

باوجود خستہ حال مکان اپنے مکینوں کی سفید پوشی کا بھرم لئے اس طرح کھڑے تھے جس طرح اندر سے شکستہ لوگ، مجبوری یا مروّت میں، زندگی کا بار اُٹھانے پر مجبور ہوا کرتے ہیں۔

گلن کے بتائے ہوئے پتہ کے مطابق گلی کے نکّو والا مکان اور کلیجی رنگ کا دروازہ اور دروازے کے درمیان آڑی ترچھی جھری یہ ہی تھی۔ دروازہ کے سامنے میونسپلٹی کا نل اور نل کی ٹوٹی ہوئی ہودی بھی تھی۔ ہودی کے بیچ و بیچ طرح طرح کے برتن رکھنے سے پڑنے والا گڑھا بھی موجود تھا۔ اُستاد نے جی کیڑا کر کے، دروازے پر، دھپ دھپ کے تین وار کر ڈالے....... ''کس سے ملنا اے آپ کو.......'' چہرے کے بجائے اُستاد کی نگاہ فیرنی کی دو سکوریوں میں جکڑی گئی۔ پہلے دودھ....... پھر ربڑی....... پھر ملائی....... اُستاد کے جنگاسوں میں خارش ہونے لگی۔ آج کی بات تھوڑی ہے، گذشتہ بیس سالوں سے اُستاد میرن کی لونڈیا مینا کی نشانی جنگاسوں سے لگائے پھرے ہیں۔

مینا اصلی نام نہیں تھا۔ نام تو نسیم تھا جسے جہالت یا پیار نے بگاڑ کر مینا کر دیا تھا۔ چھوٹے، قد، بھرواں سڈول جسم اور تیز دھار زبان والی مینا، حرافہ شادی سے پہلے بھی تھی۔ اُستاد سے اُس کا براہ راست ٹاکرا کبھی نہ ہوا تھا کیونکہ کچی لین پر چلنے والی گاڑی پکی لین پر چلنے سے کتراتی ہے۔ اس روز اُستاد مینا کے گھر اُس کے بھائی گبّو سے ملنے گئے تھے۔ دروازہ پر مینا مل گئی جس نے چھوٹتے ہی اُستاد کو نظر خراب ہونے کا طعنہ دے ڈالا۔ اُستاد کو بہت غصہ آیا۔ جواب میں اُستاد نے بھی اَول فَول بک ڈالی۔ ''فلانے کی جنی میرے مُومت ایوَنی تو کر کری کر کے رک دوں گا.......'' مینا نے جلتی پر پانی ڈالنے کے بجائے تیل چھڑک ڈالا....... ''بوت دیکیں میں نے تیرے جیسے سُورما....... میں نی ڈرنے والی.......'' اُستاد کے پاس دو راستے بچے تھے اوّل اپنی مردانگی کا ثبوت دیتے دوئم نامردی کا لیبل لگوا کر لوٹ آتے....... دھت سے ہاتھ بڑھا کر، کھیر کے دونوں کٹورے یہ کہتے ہوئے بے آسرا کر دیئے....... ''سالی...! کسی مرد سے پالا نی پڑا تیرا.......'' ناگن نے اس افتاد کے سامنے دوپٹہ کو ڈھال بنایا اور گھر کے اندر چھلانگ لگا دی....... اُستاد کہاں رُکنے والے تھے .... اُستاد کے ساتھ ناگن کی لگائی ہوئی آگ کے شعلے بھی گھر کے اندر تک پہنچ گئے....... ناگن نے بڑی قسما دھرمی کی....... بڑا یقین دلایا....... اُس کا مقصد اُستاد کو بے عزت کرنا نہیں وہ تو مذاق کر رہی تھی..... عام نسل کا سانپ، آپ کی مرضی سے آ کر آپ ہی کے کہنے پر واپس بھی جا سکتا ہے.....

مگر..... اِچھا دھاری ناگ.......! آتا بھی اپنی مرضی سے ہے اور جاتا بھی اپنی خوشی سے ہے.......

دھینگا مشتی پر ناگن نے اُستاد کو نظام الاوقات سے ڈرایا . . . . . طرح طرح سے بہلایا....... پھسلایا....... مگر....... اُستاد.......! اِچھا دھاری ناگ کا سَر کچلنے میں کامیاب نہ ہو

سکے......!

☆

اب کی بار اُستاد نے دروازہ کھٹکھٹانے کے بجائے...... بندو .... ابے او بندو ...... کہہ کر زور زور سے آوازیں دینا شروع کر دیں۔ چھجے کی اوٹ سے' سترہ اٹھارہ برس کے خوبصورت وخوبرو نوجوان نے سَر باہر نکال کر'' کون اے بے'' کہا اور نیچے کی طرف دیکھ کر لجاجت سے بولا...... ''ارے اُستاد تم...... ''اُستاد نے خون میں اُٹھنے والے بلبلوں کی گدگدی کو دباتے ہوئے کہا...... ''اُستاد کے جنے......! جری نیچے تو آ...... ''اُستاد نے بندو کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو فراموش کرتے ہوئے گرمجوشی سے گلے میں بانہیں ڈال کر' بندو کے کلّے پر زور سے پیار کیا اور ران پہ ہاتھ مار کے بولے...... ''بیٹا جی کون سی چکّی کا کاکے آئے او......بوت جان پکڑ لی اے..... کسم الا پاک کی تیرے بگیر جرا جی نہ لگا امارا......''جملہ مکمل ہوتے ہی اُستاد کا ہاتھ ایک مرتبہ پھر بے تکلفی پر مائل تھا اُس سے پہلے بندو کی جوان ومضبوط کلائی نے اُستاد کے ہاتھ کو اڑنگی لگا کر بات کا رُخ موڑ دیا...... اُس کے ذہن کی چرخی پیچھے کی جانب رَڑ کنے لگی......!

''ابے بس کر' لونڈیوں کی طریو ٹسوے کیوں بار یا اے.... سالے....! جس وکت' اُستاد پیارے کان مجھے لے گئے تے' مارے گوسی کے نیند نہ آوے تی مجے...... کاں اُستاد پیارے کان اور کاں کلی گروں کا لونڈا...... تُو پکر نہ کر' بڑی جلدی تجے نامی گرامی پیلوان بنا دوں گا......پر توبی جی کول کے موج میلہ کیجو......پر ایک بات یاد رکیو...... عورت جات کے پاس بُھول کے بی مت جئیو...... مرد کی ساری تاکت کینچ لے ویں سالی......ابے چل مرا کیوں جا ریا اے...... یہ پیسے لے...... جا موج میلہ کر' کا پی......اور دیکیو ارام کے جنے اگر کسی سے کچ کیا نا..... کسم الا پاک کی...... گسیڑ کے رک دوں گا......''چمکتے لشکتے رامپوری چاقو کو ہوا میں لہراتے ہوئے اُستاد نے جملہ مکمل کیا تھا......

''بس اُستاد کیا بتاؤں...... بمبئی سیر کیا...جنت اے جنت.... میاں....! کام تو واں پہ چٹکی بجاتے مل جاوے.... چا' روٹی اتی سستی...... چار چے آنے میں پیٹ بر جاوے آدمی کا..... اور میاں.... ! لگائی..... اُستاد..... ! کدم کدم پہ مکّی کی طریو بھنبناتی پرے ایں سالی......اور اُستاد....! ہنڈی باجار میں تو کسم الا پا کی دیکنے والا نجارا اوے اے......بارا بارا' چودا چودا سال کی ایسی ایسی نکی اوئی لونڈیا پانچ چے روپے میں مل جاوے اے کہ اتو ڑا لے کے بی جاؤ تو سالی کے پیڑے نہ ٹوٹیں......اور اُستاد....! تم سام کے وکت جوؤ اور چوپاٹی پہ نکل جاؤ تو کسم اے پیدا کرنے والے کی.... نجارے ای نجارے اوویں...... ایسی ایسی جوان اور کسی اوئی ادنگی

لونڈیئں سیر کرتی نجر آویں کہ آدمی' اریان رے جاوے... اور اُستاد .... ! کیا بتاؤں....... باندرا' اندیری' دادر میں تو یہ سالے بڑے بڑے اداکار کیڑے مکوڑے کی طریو پڑیں....... ایک دن سُبا ای سُبا' نائی کی دکان پہ' بال کٹوانے چلا گیا میں .... کیا دیکوں سات والی کرسی پہ راج کپور' مونچیں بنوا ریا اے....... میں نے کیا اجی ام نے تو سنا اے سارے اداکار گر پہ داڑی بناویں....... تم کیوں یاں چلے آئے....... پتا اے اُستاد....... ! راج کپور نے کیا کیا....... بولا.... ! داڑی تو ام بی گر پہ بناویں..... مونچیں سیٹ کرانے' دُلارے میاں کے پاس جرور آویں.... اُستاد... ! میرا جی چاوے تا کہ میں وِس سالے راج کپور کا گر تو دیکوں اُس کے پیچے جا کے مگر وہ نائی کا لونڈا اِتنا ڈیلا تا جتنی دیر میں راج کپور کی مونچیں سیٹ اوئیں اُتنی دیر میں' سالا میری کلمیں بی سیٹ نہ کر سکا....... گرم پانی سے بال نرم کر کے چپڑ چپڑ چپڑے پہ اُسترا تیج کرتا رے گیا....... پتا اے اُستاد.... ! راج کپور نے جیب سے اَٹنی نکالی اور نائی کو دے کے سورلیٹ میں بیٹ چمپت او لیا....... اُستاد.... ! بڑی دولت اووے اِن سالے اداکاروں کے پاس.......''

بندو کی غفلت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے' اُستاد بندو کی گردن میں بانہیں ڈال کر بولے ..... ''ابے جاستی بیڑ نہ مار........ سب جانوں اوں میں ...... سب پتا اے مجے .... کتنیبار' سالوں نے بلایا....... کتنیبار' نوتہ بیجا....... کتنی بار منت ساجت کی کیویں تے....... اُستاد.... ! ایک بار تم بمبئی میں دنگل کے لئے آ گئے تو سارے ریکارڈ ٹوٹ جاویں گے....... بمبئی میں بڑی دُوم اے تمارے نام کی....... میاں.... ! تمارے نام پہ تو ساری ایرونیں دوڑی چلی آویں گی....... میں نے کیا میاں.... ! لانت بیجوان پر کٹی کبوتریوں پہ میں تو موت تا بی نی اِن پہ.......''

''بڑی گلتی کی اُستاد تم نے....... کسم الاّ پاک کی نوٹوں کے ڈیر لگ جاتے....... یاں پہ تو کُچ بی پیسہ نی اے....... بمبئی میں تو بوریوں میں نوٹ رکّیں لوگ.......'' اُستاد کی بات میں وقفہ آتے ہی بندو نے گرہ لگائی۔

''ابے رہنے دے....... بڑے دیکے ایں میں نے نوٹ ووٹ..... چوڑ ان فجول باتوں کو....... کام کی بات کر کام کی....... تُو یہ بتا ملنے کا کب ارادا اے.......؟'' اُستاد کے اچانک اور دوٹوک سوال پر بندو چونک پڑا' جب وہ بولا تو اُس کی آواز میں پہلے والی اُٹھان نہ تھی....... ''میاں چوڑو بی....... کوئی اور بات کرو....... سناؤ اُستانی کا کیا آل اے....... بچے کیا کریں.......''

''دیک بے بندو.... ! جادا سُرتا نہ بن ..... آنا کانی کسی اور کو دیکو....... بیٹا.... ! اُستادوں سے اُستادی نی چلتی..... سیدی طریو بتا' ملنے کا ارادا اے کے نی..... '' اُستاد کے لہجہ

میں غصہ کا ترشح نمایاں تھا جسے بندو نے محسوس تو کیا لیکن اُستاد کو براہ راست جواب دینے کے بجائے تیکھی نظروں سے اُستاد کے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے بولا......! ''اُستاد.... ! ابی تو آیا اُوں.....پر کبی دیکیں گے...... '' ''نہ میری جان.....! ٹال مٹول سے کام نی چلے گا...... تجے کیا پتا.....! تیری جدائی کے دن، یاراوروں نے کس طریو کاٹے ایں...... کل تجے کا دن اے......یار جی، دکان بند کر کے جُما پڑنے جاویں گے اور مسجد سے سیدے تجے لینے آویں گے...... بڑے دن باد ایدر کی اَلیم بریانی اور نیم پیلوان کی نان کتائی کاویں گے...... سام کو پورواپیاج علی میں پُورے پیلوان کی کس کاس والی چاپی کے بینسالی پہ گُومیں گے......سج گیا اچی طریوٗ پر سمجاوٗ......'' بندو سپاٹ چہرہ لئے کھڑا تھا...... اُستاد کی تاکید پر ''جی اُستادٗ'' کہہ کر ''سلاوالیکم'' کہا اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھ گیا......

☆

تیسری آواز پر بندو نمودار ہوا تو اُستاد کی نظر بندو پہ ٹک کے رہ گئی۔ بندو نے ٹیرالین کی کالی چست پینٹ پر نارنجی شرٹ پہن رکھی تھی جس کی آدھی آستینوں سے بندو کے بازو کی مچھلیاں پھڑک کر باہر آنے کو بے چین تھیں۔ سڈول رانیں اور اُبھرے ہوئے کولہے ہر قدم پر اس طرح لیفٹ رائٹ کر رہے تھے جیسے طبلے کی تھاپ پر رقص کر رہے ہوں۔ چہرہ کی لالی اور اُس پر جوانی کی چمک کھلتے ہوئے تازہ گلاب کی کیفیت پیدا کر رہے تھے۔ تازہ بھیگتی مَسیں، مردانہ وجاہت کو نمایاں کر رہی تھیں...... ''وا بیٹا وا......! کوب جوانی چڑی اے تجے...... کیا کاوے تا واں پہ......مُوسے ای کاوے تا نا......!'' آخری جملہ مکمل کرتے ہوئے اُستاد نے بائیں آنکھ دبا کر بندو کے کولہے پر چٹکی کاٹی تو بندو نے ناگواری سے اُستاد کو پیچھے کی جانب دھکیل دیا۔ بندو کے ہلکے سے دھکے پر اُستاد گرتے گرتے بچے...... ''ماف کرنا اُستادٗ'' کہہ کر بندو نے اُستاد کو تھاما تو بندو کو لگا کہ وہ اُستاد کو نہیں کسی بوڑھے شخص کو گھسیٹ رہا ہے......

بندو نے غیر محسوس طریقہ پر اُستاد کے سراپا کا جائزہ لیا تو اُسے اُستاد کے ڈھانچے میں کافی تبدیلی محسوس ہوئی۔ چہرہ پہلے کی نسبت کافی ڈھلک چکا تھا۔ ناک کے دونوں جانب، موٹی سلوٹ پڑنے کے باعث گال نیچے کو لٹک گئے تھے۔ چھاتی کی چوڑائی بھی پہلے سے کم اور بازوؤں کی مچھلی کا اُبھار پہلے کی نسبت کافی کم ہو چکا تھا۔ ہاتھ کی نسیں بھی اُبھر آئی تھیں۔ ہاتھوں پر گوشت کی بجائے کھال ہی باقی بچی تھی وہ بھی خزاں رسیدہ ہو چکی تھی۔ دانت بھی اُستاد کے پورے نہ بچے تھے جتنے باقی بچے تھے اُن کے درمیان خلا زیادہ ہونے کے باعث اُستاد کی آواز میں پہلے سی کڑک نہ رہی تھی......رکشہ کے انتظار میں کھڑا رہنے کے بجائے، دونوں نے پیدل چلنا شروع کیا تو بندو نے

محسوس کیا کہ اُستاد پہلے کی طرح تیز اور بڑے قدم اُٹھانے کے بجائے آہستہ روی سے چل رہے ہیں پھر بھی اُن کا سانس ہموار نہیں ہے......

☆

''اے کیا سوچ ریا اے...... کاتا کیوں نی......'' اپنی پلیٹ سے' ران کی گول بوٹی' بندو کی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے اُستاد نے بندو کوٹوکا تو بندو کو احساس ہوا کہ کھانے سے زیادہ اُس کا دھیان' سامنے والے چھجے کی جانب ہے۔ آج سے پہلے جب جب بندو اُستاد کے ساتھ' حیدر کی حلیم بریانی کھانے آیا کرتا تو پردے کے پیچھے سے دو نسوانی آنکھیں اُس کی توجہ کا مرکز ہوا کرتی تھیں۔ باوجود کوشش کے بندو کبھی اُس حسینہ کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ بس اتنا ضرور جان سکا کہ اِن بے چین و بے قرار آنکھوں کا مرکز سامنے والی پتنگ کی دکان ہے جہاں بیس بائیس سال کا بھولا بھالا وجیہہ نوجوان' ایک نظر سامنے والے چھجے پر اور ایک سامنے بیٹھے بوڑھے باپ پر ڈال کر' پتنگ بنانے میں مصروف رہتا تھا۔ وقفہ وقفہ سے' نوجوان کی مشتاق آنکھیں اسی طرح نیچے اوپر کی ورزش میں مصروف رہتیں تھیں۔ بندو کے دل میں' بڑی شدت سے یہ خواہش اُبھری کہ وہ حیدر حلیم والے سے' پردہ کے پیچھے والی لڑکی اور پتنگ کی بند دکان کی بابت دریافت کرے۔ اُس نے حیدر سے بات کرنے کے لئے منہ بھی کھولا مگر دائیں بائیں کھڑے سات آٹھ گاہکوں کی موجودگی نے اُس کو اپنے ارادے سے باز رکھا......

''اے بندو کیا بات اے......؟ تُو جب سے آیا اے......بڑا چُپ چُپ اے......بیٹا......! بمبئ میں کوئی گُل تو نی کِلا آیا......'' ''چوڑو اُستاد......فجول باتیں مت کرو......میرا کیال اے اب چلنا چاہیئے......رات بوت اوگئی اے......امّاں انتجار کرری او گی......'' ''وابیٹاوا......! یار جی کی رات برآ نک نہ جھپکی اور تجے' اماں یاد آری رے......چُپکا او کے چلا چل نی تو سالے کی کنپٹی سیک کے رک دوں گا......''

جملہ مکمل کرتے ہی اُستاد آگے آگے اور بندو پیچھے پیچھے چل پڑے۔ سڑک پر آتے ہی کئی نئے پرانے سائیکل رکشہ' ایک ساتھ آ کرُ کے۔ اُستاد سوچ ہی رہے تھے کہ کون سے رکشہ میں بیٹھیں اور کون سے میں نہ بیٹھیں' تیسرے نمبر کی رکشہ والے نے اُستاد کو پہچان کر اونچی آواز میں ''سلاوالیکم اُستاد'' کہا تو اُستاد خوشی سے اُچھل پڑے......''لے بے بندو! یہ تو اپنا سبراتی نکل آیا......اب تو یار جی اسی کے رسکے میں جاویں گے......''

☆

حسبِ سابق' اُستاد کی دکان کے باہر' آوارہ کُتوں کا جھمگٹا لگا ہوا تھا۔ ہمیشہ کی مانند' اُستاد

کو دیکھ کر بھی کُتّے آہستہ آہستہ تتر بتر ہونے لگے۔ ایک کُتا جم کر اپنی جگہ کھڑا رہا۔ جُوں جُوں اُستاد اُس کے نزدیک ہوئے اُسی رفتار سے اُس کی دُم ہلنے لگی۔ مدت سے یہ کتا اُستاد کا رفیق اور اُن کی دکان کا رکھوالا تھا۔ نہ جانے کب سے اُستاد کی دکان کے باہر ڈیرہ جمائے بیٹھا تھا۔ جس وقت یہ نیا نیا آیا تھا تو علاقہ کے کتوں پر اس کا بڑا رعب تھا۔ جسیم ہونے کے ساتھ' دانتوں اور پنجوں کا تیز ہتھیار بھی اُس کی دہشت کا سبب تھے۔ اُستاد کی دکان سے ملنے والے راتب کے ساتھ دکان سے ذرا ہٹ کر کوڑے کے ڈھیر سے ملنے والا مال متاع اُس کی شکم سیری کا ذریعہ تھے۔ عمر بڑھنے اور وقت گذرنے کے ساتھ محلے کے کُتوں پر اُس کا رعب کم ہوتا جا رہا تھا۔ مقابلے میں بہت سے تندرست و توانا کُتے آ گئے تھے۔ اُستاد کی ہلہ شیری نے اُس کی سرداری کا بھرم قائم رکھا ہوا تھا...... اپنے لاڈلے کو پچکارنے اور محلے کے دیگر کتوں کو گالیوں کی چاند ماری سے للکارنے کے بعد' دو تین مرتبہ کھنکار کر اُستاد نے گلہ صاف کرنے کی کوشش کی۔ ناکامی کے بعد' چھاتی کا پورا زور صرف کر کے' فیصلہ کُن انداز میں گلے کے پمپ پر کھنکار کا ایک اور ہتھوڑا مارا حلق سے بلغم کی زردی اُگلی اور کرتے کی دائیں جیب سے دکان کی چابیوں کا گچھا نکال کر' بندو کی طرف اُچھالا اور خود تہ بند اوپر کر کے پیشاب کرنے کی غرض سے دکان کے سامنے بہنے والی نالی کے کنارے بیٹھ گئے......

☆

دکان کے پچھلے در کا دروازہ بند ہوتے ہی' کتوں کی منڈلی گوں گوں کر کے پھر سے جمع ہونا شروع ہو گئی۔ کوڑے کے ڈھیر پر' تلاشِ رزق میں سبقت لے جانے میں سارے کتے ایک دوسرے پر جھپٹنے لگے...... چھینا جھپٹی کی اس دوڑ میں' اُستاد کا چہیتا' تنومند اور توانا کتوں سے مقابلہ نہیں کر پا رہا...... بہت محنت اور جدوجہد کے بعد اس کے ہاتھ کوئی ہڈی بوٹی لگنے لگتی تو تندرست و توانا کتے دھکیل کر اُسے پرے کر دیتے...... بظاہر پسپائی اُس کا مقدر لگ رہی ہے...... بوڑھا کتا ابھی ہمت نہیں ہارا...... نوجوان و نوعمر کتوں کی منہ زوری کے باوجود...... حلق سے خوفناک آوازیں نکال کر اپنا حصہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے...... نوجوان کتے' اُس کی چالاکی و عیاری کو طاقت کے زور پر ناکام بنا رہے ہیں...... بوڑھا کتا ارادے کا مضبوط...... مگر...... جسمانی توانائی اُس کا ساتھ نہیں دے رہی...... کم از کم وہ...... پسپائی کے نام سے ناآشنا ہے...... غصہ اور جھنجھلاہٹ میں حلق سے عجیب وغریب آوازیں برآمد ہو رہی ہیں...... کوئی ہے جو وقت کی انہونی کو ٹالے.... گلے سے نکلنے والی آوازوں میں غصہ کے ساتھ کرب نمایاں ہو رہا ہے...... رات تیزی سے ڈھل رہی ہے...... نوعمر و نوجوان کتوں کا جنون بڑھتا جا رہا ہے...... رات کی سیاہی نے پسپائی کا اعلان کر دیا ہے...... ڈھلتی عمر کا کتا تیزی سے ڈھلوان پر پھسلنے لگا ہے...... رات اور

بھیگ گئی ہے...... مقابلہ اور سخت ہو گیا ہے...... حکمت پر طاقت غالب آ رہی ہے...... ادھر سے فیصلہ کن وار ...... اُدھر سے بھرپور جواب ...... ایک کی اڑنگی ...... دوسرے کی جھکائی ...... اس کا بازو ...... اُس کی گردن ...... نوجوان کتا ...... بزرگ کتا...... نوجوان...... بزرگ...... کتا...... آدمی...... آدمی...... کتا...... رات بے بس ہو گئی ہے...... سناٹا اور چھا گیا ہے...... اندھیرا اور بڑھ گیا ہے...... کہیں رات ڈھلنے کا ماتم ہو رہا ہے...... کوئی رات کو قیامت سے تشبیہ دے رہا ہے...... کوئی بھونکنے سے زیادہ ٹھنک رہا ہے...... کوئی رونے سے زیادہ ٹھنک رہا ہے...... کسی کی آواز خاموشی سے ٹکرا رہی ہے...... کوئی خاموشی سے سر ٹکرا رہا ہے...... میدانِ کارزار پہ سناٹا چھا گیا ہے...... منہ زور کتے پُرسکون ہو گئے ہیں...... عجب کیفیت ماتمی ہے...... کہیں خوشی کہیں غمی ہے...... کوئی رو رہا ہے شبِ غم گذار کے...... کوئی جا رہا ہے بوجھ دِل کا اُتار کے......؟؟؟؟

ادھ کھائی بوٹیاں

خواہ مخواہ! لہروں اور روشنی وغیرہ کی رفتار کو ایک دوسرے سے تیز ثابت کرنے میں توانائی ضائع کی جاتی رہی۔ ہماری رائے میں انسانی خیالات سے کسی چیز کی رفتار تیز ہو ہی نہیں سکتی۔ پلک جھپکنے سے پہلے، آپ! لاہور، اسلام آباد، کراچی، دلّی، ممبئی، مدراس، لندن، نیویارک، پیرس، ٹوکیو وغیرہ کا چکر کاٹ کر لوٹ سکتے ہیں۔ اس تمام سفر میں آپ کا ماضی مختلف چولے بدل کر آپ کے ہمراہ، ہچکولے کھانے لگتا ہے۔ کبھی آپ! محبوبہ کی بانہوں میں ہوتے ہیں تو کبھی ماں کی آغوش میں اور کبھی بچپن کے دوستوں کی بے تکلف ٹولی میں۔ ماضی کا تمام حصہ آپ کی دسترس میں، گھر کے کمپیوٹر کی مانند ہوتا ہے جتنا سکون اور خاموشی آپ کے گرد و پیش ہو گی اتنا ہی گذرا ہوا کل آپ سے بغل گیر ہو رہا ہو گا۔ چونکہ استعداد سے بڑھ کر، اپنے کاندھوں کو ذمہ داریوں میں جکڑا ہوا ہے اس لئے ہمیں گذرے ہوئے کل سے بے تکلف ہونا نصیب نہیں! کبھی فرصت کے لمحات میسر ہوں تو موموہمیں بے چین کئے رکھتا ہے۔

مومو میرا آخری اور لاڈلا بچہ ہے۔ گھر میں اُس کا کوئی ساتھی، سنگی نہ ہونے کے باعث، وہ طرح طرح کے مشغلے اختیار کرتا رہتا ہے۔ اس وقت گھر کے غیر اعلانیہ فرد، کوری ڈور اور لان کے کُلی مالک، بھُورے بلّے کو ہڈیاں کھلا رہا ہے مگر میں جانتا ہوں کہ ان ہڈیوں میں اب بھی اُس کی خوراک سے زیادہ گوشت موجود ہے۔ مومو صاحب کھانے کے دوران اپنی پلیٹ میں وقفے وقفے سے تین چار بوٹیاں ڈال لیتے ہیں اور برائے نام چکھ کر اپنے بلّے

کے لئے ہڈیاں کہہ کر بچا لیتے ہیں۔ یوں اپنی ماما کی ڈانٹ سے صاف بچ کر' بھورے بلّے کی پیٹ پوجا کا سامان کر لیتے ہیں۔

مجھے' ایک نظر مومو اور دوسری بھورے بلّے پر ڈالنے کے بعد ''سویٹی'' اور اس پر گزرنے والی داستانِ الم یاد کر کے چاروں طرف اداسی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ جس کے بعد دنیا کے سب سے خونخوار' بڑے اور بھیانک بھورے بلّے کی جانب توجہ مرکوز ہو جاتی ہے اور اپنی حیثیت ''سویٹی'' کے برابر لگنے لگتی ہے جس کا دو بوند دودھ یا دو تولے چھیچھڑے بھی بھورے بلّے کو بہت کھٹکتے تھے۔ بھورا بلا ''سویٹی'' کی موجودگی کو ایک منٹ کے لئے برداشت کرنے کو تیار نہ تھا۔ شائد! بھورے بلّے کو اپنی سلطنت میں ''سویٹی'' کی مداخلتِ بے جا پسند نہ تھی یا وہ اسے مستقبل میں سخت حریف کے طور پر دیکھنے سے خوفزدہ تھا۔

کہتے ہیں! خوف کسی بھیڑیئے یا شیر کا نام نہیں' یہ انسان کے اندر موجود ہوتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے اندر یہ خوف کب اور کیوں در آیا؟ اور اس کے در آنے کے اسباب کیا ہیں؟ جس طرح ہماری شکلیں' سوچ اور ترجیحات مختلف ہیں اُسی طرح ہمارے اندر چھپا خوف بھی مختلف نوعیت کا ہے۔ کسی کو غمِ عشق' کسی کو غمِ روزگار' کسی کو حُسن و جوانی کے چلے جانے کا غم' کسی کو مال و دولت چھن جانے کا خوف اور کسی کو اختیار و اقتدار سے محرومی کا اندیشہ! سوال ایک اور بھی نکل آیا ہے جب ہم اپنی اپنی محنت اور قسمت کے مطابق پھل پا رہے ہیں تو پھر اس خوف نے ہمارے اندر کیونکر بار پالیا ہے؟ قصہ دراصل یہ ہے کہ ہم میں سے ہر کوئی اپنا کاتبِ تقدیر اور ناخدا بن بیٹھا ہے اپنی استعداد کو ہر طریقے پر کام میں لاتے ہوئے معاشی' معاشرتی اور جسمانی استحکام کا خواہش مند ہے۔ جسے ہم مصنوعی اور غیر فطری طریقے پر قائم رکھنا چاہتے ہیں اور ہر وقت اس کے چھن جانے کے خوف میں مبتلا رہتے ہیں۔

ہمارے محلے کا کریانہ فروش بنارس خان تین دہائی قبل محنت مزدوری کے لئے شہر آیا تھا جہاں کچھ عرصے بعد ایک خدا ترس انسان نے اُس کی مدد کرتے ہوئے' کریانے کی دکان کھولنے کا مشورہ دیا اور اپنے مکان کا ایک کمرہ بھی اس مصرف کے لئے معمولی کرائے پر اُسے دے دیا۔ آج! بنارس خان نہ صرف اُس مکان کا مالک جسے توڑ کر اُس نے بہت سی دکانوں پر مشتمل مارکیٹ بنالی ہے بلکہ اور بھی منقولہ و غیر منقولہ جائیداد کا مالک ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی کاروبار میں ٹانگ پھنسائی ہوئی ہے۔ بنارس خان جب نیا نیا دکان دار بنا تھا بڑا خوش اخلاق' ملنسار اور قسمت پر شاکر رہنے والا انسان تھا۔ جب سے اُس کے مقابلے پر رجب علی

نے دکان کھولی ہے وہ طرح طرح سے رجب علی کو تنگ کرنے پر آمادہ رہتا ہے۔ ہر وقت اُس پر چڑچڑاپن طاری رہنے لگا ہے۔ اسی یاسیت کے سبب وہ گاہکوں سے تُرش روئی کا مرتکب بھی ہوتا ہے۔ بات بات پر کاروبار کے خسارے اور گھریلو اخراجات کا ذکر کر کے طرح طرح کے اندیشوں کا اظہار کرتا ہے حالانکہ وہ اب بھی محلّے کے درجنوں گھروں کا پالن ہار بنا ہوا ہے۔ جنہیں وہ روزمرّہ کی اشیاء من پسند داموں پر فروخت کر کے احسان بھی جتلاتا اور بار بار سودا بند کرنے کی دھمکی بھی دیتا ہے۔ بیچارے مزدوری پیشہ اور کم آمدن والے لوگ اُس سے سودا لینے پر مجبور بلکہ اُس کی جھڑکیاں کھا کر بھی بے مزہ نہیں ہوتے۔ اُن کے پاس کوئی اور چارہ نہیں۔ نہ وہ بنارس خان کی رقم ادا کر سکتے ہیں اور نہ مُکتی پا سکتے ہیں۔

پچھلے دنوں عبداللطیف اور خان بہادر بچوں کی لڑائی پر آپس میں اُلجھ پڑے۔ نوبت ہاتھاپائی تک پہنچ گئی۔ خان بہادر نے عبداللطیف کے خلاف پرچہ درج کرا دیا۔ جبکہ عبداللطیف مدد کے لئے اپنے علاقے کے کونسلر اسلام الدین کے پاس پہنچ گیا۔ تھانے دار نے خان بہادر اور اسلام الدین نے عبداللطیف کی خوب خوب سرزنش کی۔ اسلام الدین نے عبداللطیف کو پولیس کا ڈراوادے کر اور تھانے دار نے خان بہادر کو اپنے اوپر نگران فورس کا حوّا دکھا کر پانچ پانچ ہزار روپے اینٹھ لئے۔ اس کے علاوہ عبداللطیف نے ایک سے ڈیڑھ ہزار روپیہ اسلام الدین کے کارندوں پر لٹایا اور قریب اتنے ہی پیسے خان بہادر سے تھانے کے لوئر اسٹاف نے اچک لئے۔ دونوں فریقوں کو ایک ہفتہ بھگا دوڑا اور ڈرا دھمکا کر صلح پر آمادہ کر دیا گیا۔ دونوں کو کچھ وقت گزرنے کے بعد اپنے ساتھ ہونے والی واردات کا علم ہوا تو اُن کے لئے دادرسی کا کوئی بھی دَر دستیاب نہ تھا۔

یہ واقعہ بھی زیادہ پُرانا نہیں! مغربی سرحدی ملک کے بہت سے باشندے' اپنے ملک کی خراب سیاسی' سماجی' معاشی صورتحال کے باعث ہمارے یہاں آ کر بس گئے اور طرح طرح کے جائز و ناجائز پیشے ایجاد کر لئے۔ ایک خاندان سترہ افراد پر مشتمل تھا جس کا سربراہ ولی داد خان تھا۔ یہ سات بھائی' تین بہنیں' دو ماں باپ اور پانچ بچوں پر مشتمل کنبہ تھا۔ محنت مزدوری سے معاشی حالات پر قابو پانا ممکن نہیں ہو رہا تھا لہٰذا ساتوں بھائیوں نے مل بیٹھ کر نئی سمتوں میں پیش رفت کا پروگرام ترتیب دیا۔ دو' علاقہ غیر سے ہلکی بندوق' پستول اور گولیاں لا کر فروخت کرتے دوسرے دو منشیات فروشی سے منسلک ہو گئے اور تیسرے دو نے محلّے میں دادا گیری کا سکہ جمانا شروع کر دیا جبکہ سب سے بڑے نے سارے کام کی نگرانی کا

ذمہ اٹھالیا۔ رفتہ رفتہ اس خاندان کے پنجے گڑنے لگے تو ان کاموں کے پُرانے اور مقامی سرغنہ سے اُن کی چپلقش کا آغاز ہوگیا۔ آہستہ آہستہ باہمی چپقلش بڑے مناقشے کا رُوپ دھار گئی۔ دن کی روشنی میں عوام کے محافظوں کے درمیان' نئے گروہ نے پُرانے گروہ کے تمام سرکردہ افراد کی لاشیں گرادیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ قانون کے محافظوں نے اس خونریزی کو روکنے کے بجائے بھاگنے میں عافیت سمجھی کیونکہ انہیں عوام سے زیادہ اپنی جانیں عزیز تھیں۔

اس واقعہ کے بعد قاتلوں کا دبدبہ' عوام اور پولیس دونوں پر قائم ہوگیا۔ انہوں نے تمام قتل کا ذمہ دار ایک بھائی کو قرار دلوا کر اُسے عمر قید کرادی رات دن کی مناسبت سے یہ قید دس سال میں ختم ہوگئی جس کے دوران قیدی کو جیل میں ہر وہ آسائش دستیاب رہی جو کہ گھر میں ہوا کرتی ہے۔ اب یہ لوگ' آدھے شہر کی قسمت کے مالک سیاسی' سماجی اور معاشی حوالے سے معتبری کی معراج پر فائز ہیں۔

ہم نے جس گروہ کا قصہّ اوپر بیان کیا ہے۔ اس سے قبل بھی شہر کے دوسرے سرے پر آباد ایک گھرانہ پانچ دہائی قبل آ کر آباد ہوا تھا جس نے اپنی طاقت کے بل پر قمارخانوں کا ایک وسیع جال شہر میں پھیلا دیا تھا۔ جسے دعوے کے باوجود کوئی حکومت ختم نہ کرسکی۔ مذکورہ گروہ نے قماربازی سے کمائی گئی دولت پر اپنی خودساختہ مملکت قائم کرلی اور غریبوں کی قسمت کے مالک بن کر سیاست کے ٹھیکیدار بھی بن بیٹھے۔

بے چینی واضطراری کی خاموش لہر عوام کے دلوں میں زور مار رہی تھی جس کا اظہار انہوں نے' جرأت و بیبا کی وحق گوئی کے داعی ایک پڑھے لکھے نوجوان کو شہر کی تنگ وتاریک گلیوں سے نکال کر حکومتی ایوانوں میں پہنچا کر کیا اور راتوں رات اپنی تقدیر بدلنے کے خواب دیکھنا شروع کردیئے۔ نوارد! تازہ دم' زیرک اور متحرک نمائندہ ثابت ہوا' تھوڑے ہی عرصے میں تبدیلی کے آثار ظاہر ہونے لگے .... پہلے کی طرح اُس کے شہر میں ناجائز اسلحہ بھی بکتا ہے' منشیات فروشی بھی ہوتی ہے' قمارخانے اور قحبہ خانوں کا کاروبار بھی زوروں پر ہے۔ البتہ! ان سب منافع بخش کاروبار کی نگرانی اور سرپرستی اب وہ خود کرتا اور بھاری بھتہ وصول کرتا ہے۔ جس کا معقول حصہ باقاعدگی سے اپنے سے اوپر والوں کو ارسال کردیتا ہے۔

کیا آپ کو اپنے کوچہ و بازار میں مختلف صورتحال کا سامنا ہے.....زید' بکر سے ملئے اور پوچھئے ....اُنہیں اپنے شہروں کی گلیوں اور چوراہوں میں جگہ جگہ چھوٹے' بڑے سائز

کے بُھورے بلّوں کا سامنا نہیں ہے؟ وقت گزرنے کے ساتھ ہماری آبادی بڑھ رہی ہے مگر .... اُس سے بھی زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ' بھورے بلّوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ .... مذہب ...' سیاست ...' معاشرت .... روزمرہ کاروبار حتی کہ ضروریاتِ زندگی صحت' صفائی' تعلیم' ٹرانسپورٹ' تعمیرات اور کھانے پینے کی اشیاء پر بھی بھورے بلّے قابض ہیں اور ہر آبادی کے نکڑ پر بیٹھے معصوم ''سویٹی'' کا حق جھپٹ رہے ہیں۔

فرصت کے چند لمحات نکال کر .... سوچئے .... غور کیجئے .... ہماری قیادت روز بہ روز تنزلی کا شکار کیوں ہے؟ کیوں! ہر آنے والے دن کے ساتھ ... چور' ڈاکو' سمگلر' بلیکئے' ٹیکس چور ... اور ... رسہ گیر .... ہماری رہنمائی پر مامور کئے جا رہے ہیں؟ ...... اس لئے کہ ان سب درمیانہ درجے کے بھورے بلّوں میں سے جو سب سے زیادہ ...... چالاک' عیار اور شاطر ہو .... اُسے ان سب بھورے بلّوں سے ہڈیاں ہتھیانے پر مامور کر دیا جائے .... بظاہر یہ موٹا اور توانا' بھورا بلّا اپنی دھاک بٹھانے اور اپنی چودھراہٹ کو طول دینے کے لئے' گرد و پیش کے تمام ''سویٹی'' کو تہہ تیغ کرنے اور اپنی حیثیت کو بار بار ضرب دینے میں مصروف نظر آتا ہے مگر وقت آنے پر اس کا حشر بھی مومو کے ''سویٹی'' جیسا ہی ہوتا ہے ....!!

ان سب چھوٹے' درمیانے اور طاقت کے نشے میں چُور بھورے بلّوں سے .... دور .... بہت دور .... سب سے توانا' طاقتور اور شاطر بھورا بلّا بیٹھا بظاہر ہڈیاں بھنبھوڑ رہا ہے .... اصل میں وہ ہڈیاں نہیں' گوشت ہے .... زندہ انسانوں کا گوشت .... جسے کھانے سے اُس کی جسمانی طاقت کے ساتھ' سوچنے' سمجھنے کی صلاحیت بھی تیز تر ہوتی جا رہی ہے کیونکہ زندہ انسانوں کے گوشت میں حرارت اور پروٹین زیادہ ہوا کرتی ہے .... وہ پہلے اپنے حصہ کا گوشت کھائے گا! پھر ''سویٹی'' بلکہ اُس کی تمام برادری کا' اُسی طرح مار مار کر بھرکس نکال دے گا جس طرح مومو کے ''سویٹی'' کا بھورے بلّے نے نکال دیا تھا۔ اُس پر بھی ''سویٹی'' نے ہوش کے ناخن نہ لئے تو بھورے بلّے نے رات کے اندھیرے میں' سویٹی' کا کام تمام کر کے' اپنی مملکت کو' درپیش خطرے سے ہمیشہ کے لئے نجات حاصل کر لی تھی .... مومو کا بھورا بلّا شاید! اُتنا' منہ زور اور ہتھ چھٹ نہیں ہے جتنا! ہمارا اور آپ کا بھوُرا بلّا ہے .... یہ اپنے لئے خطرہ بننے والوں اور وقت پر

پوری ہڈیاں معہ گوشت نہ پہنچانے والوں کو نہ صرف دن کی روشنی میں مارتا بلکہ اُس کا اعلان بھی التزام سے کرتا ہے۔ جس کے بعد باقی بچ رہنے والے موموکی طرح 'ادھ کھائی بوٹیاں' ہڈیاں کہہ کر' خوشی خوشی بھورے بلّے کو کھلانے اور ''سویٹی'' کو بھول کر بھوُرے بلّے کی محبت کے گن گانے پر مجبور ہوتے ہیں..........!!!

☆☆☆

پھول، خوشبو اور کتاب

عالم ایسوسی ایٹ کے مالک دلشاد عالم خان کی ہدایت پر ملازم اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا تو انہوں نے حیران ہو کر ملازم سے دریافت کیا؟

''کیوں بھئی، سنا نہیں میں نے کیا کہا!''

''صاحب! سنا تو ہے، ٹھیک سے سمجھ نہیں آیا۔''

''بھئی! میں نے سادہ سے لفظوں میں تم سے کہا ہے، ایک ڈبی سگریٹ اچھے برانڈ والی اور دو خوشبو والے پان لے آؤ اور واپسی پر چائے کا آرڈر بھی دیتے آؤ، چائے سپر یٹ اور اسٹرانگ ہونا چاہئے۔''

''جی صاحب! جی، چائے، سگریٹ، پان سمجھ گیا بالکل سمجھ گیا۔'' محمد اقبال نے ہاتھوں کی انگلیوں پر تینوں اشیا کے نام دوہراتے ہوئے اپنے باس سے دھیمے لہجے میں دریافت کیا۔

''کوئی مہمان آ رہے ہیں صاحب؟''

''کیوں! یہ سب چیزیں میرے لئے شجرِ ممنوعہ ہیں؟ وہ راشد آ رہے ہیں، تھوڑی ہی دیر میں پہنچنے والے ہیں جلدی جاؤ اور جلدی آؤ''

جی صاحب جی! راشد جمال صاحب آ رہے ہیں، پھر تو میں چٹکی بجاتے گیا اور چٹکی بجاتے آیا''

''ہیلو! اے گدھے تم ابھی تک وہیں پر ننگے ہوئے ہو اور یہاں میں تمہاری

مدارات کا بندوبست کئے بیٹھا ہوں ....ٹھیک ہے، ٹھیک ہے دس منٹ سے اوپر جتنے بھی منٹ تاخیر سے پہنچو گے، فی منٹ وہی جرمانہ ادا کرنا ہوگا جو تم لوگ کالج لائف میں مجھ سے وصولتے رہے ہو۔''

آ جایئے! دروازے کے (Knock) پر دلشاد عالم خان نے ناک کرنے والے کو اندر آنے کی اجازت دی۔

''سر! میں بہت پریشان ہوں۔'' دلشاد عالم خان کی پرسنل سیکریٹری مِس افشین نے ماتھے پر گرے بالوں کو اُلٹے ہاتھ سے سر کی جانب سمیٹتے اور دائیں ہاتھ میں پکڑی ڈھیر ساری فائلوں کو میز پر رکھتے ہوئے لمبا سانس لیا۔

''آج آپ کچھ زیادہ پریشان لگ رہی ہیں۔''

''سر! مسئلہ ہی کچھ ایسا ہے۔ دلگیر انڈسٹری والے فون پر فون کئے جا رہے ہیں۔ فاران ایکسپریس والے بھی جلدی میں ہیں۔ شکور مِل والے تو کئی بار خود آ چکے ہیں اور، اور مجھے نام یاد نہیں آ رہے آپ یہ فائلیں دیکھئے، بہت سارا کام Pending ہے۔''

''ہیلو! میں آ گیا ہوں۔ صرف دو منٹ کی تاخیر کے ساتھ۔'' راشد جمال نے دروازے کی اوٹ سے جھانکتے ہوئے اندر آنے کی اجازت چاہی۔

''آ جاؤ یار آ جاؤ کسی فارمیلٹی کی ضرورت نہیں۔''

''ہاں تو مِس افشین! آپ کچھ پریشانی کی باتیں کر رہی تھیں۔''

''سر! کام کی اتنی زیادتی ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔''

''آپ بالکل زحمت نہ کریں اور نہ کسی پریشانی میں خود کو گرفتار کریں میں جیسے ہی فارغ ہوتا ہوں آپ کو کال کرتا ہوں۔ آپ تشریف لے جائیں اور اقبال آ گیا ہو تو اُسے اندر بھیج دیں۔''

''سر! اقبال کو نہ پہلے بُلانے کی ضرورت پڑی ہے اور نہ کبھی پڑے گی۔'' چائے کی ٹرے کے ساتھ اقبال نے اندر داخل ہوتے ہی اپنے باس اور اُن کے دوست راشد جمال کے سامنے کپ رکھ کر چائے انڈیلنا شروع کی۔

''کیوں بھئی اقبال! آج تم نے اپنے صاحب کے سامنے پوچھے بغیر ہی چائے کا کپ کیسے رکھ دیا۔؟''

''No,No it`s alright'' میں نے ہی اسے کہا ہے۔''

اقبال نے جیب سے سگریٹ کی ڈبی' ماچس اور پان کی پوڑیاں میز پر رکھیں تو راشد جمال نے پہلے اقبال کو اور پھر اپنے دوست دلشاد عالم خان کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

''ٹھیک ہے' تم جاؤ''

جی صاحب جی کہہ کر اقبال سعادت مندی سے باہر چلا گیا۔

''سب خیریت ہے نا! تمہاری طبیعت اور دیگر معاملات' سب ٹھیک ہے نا!''

''ہاں' ہاں سب ٹھیک' بالکل ٹھیک ہے۔ تم کیوں اتنے حیران ہو کر پوچھ رہے ہو۔''

''یہ صبح صبح تمہاری طلبی' چائے' پان اور سگریٹ کے علاوہ تمہارا جولی پن بڑا غیر متوقع ہے۔''

''یار! مجھے آج اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہو رہا ہے۔ خواہ مخواہ میں نے سنیاس لیا ہوا ہے اور بھرم چاری بن کر دُنیا کی نعمتوں سے مُنہ موڑا ہوا ہے۔'' ایک پان کھول کر منہ میں رکھتے ہوئے اور دوسرا راشد جمال کی طرف بڑھاتے ہوئے دلشاد عالم خان نے جملہ مکمل کیا۔

''اس تبدیلی کا سبب؟''

''پتہ ہے! آج صبح کیا ہوا؟'' ''تم سگریٹ پیو گے نا!'' راشد کی جانب سگریٹ کی ڈبی بڑھا کر اور راشد کے انکار پر' ڈبی میں سے ایک سگریٹ منہ میں لگاتے ہوئے'' ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا؟''

''صبح کی بابت کسی واقعے کا ذکر کر رہے تھے۔''

''تم نے کبھی نہاتے ہوئے شیشے میں اپنا چہرہ دیکھا ہے؟''

''میرے خیال میں .... نہیں۔''

''دیکھا تو میں نے کئی بار ہے مگر غور آج کیا ہے۔ یقین مانو! جب آدمی اپنے سر پر صابن لگانے کے بعد چہرے پر صابن لگاتا ہے تو وہ بہت خوبصورت اور حسین ہو جاتا ہے۔ پتہ ہے کیوں؟''

''نہیں'' .... بیزاری سے۔

''وہ اس لئے میری جان .... کہ صابن کی جھاگ انسان کے چہرے پر پڑنے والے داغ' دھبے اور ڈینٹ کو چھپا لیتا ہے اور اپنے ہاتھ کی رگڑ سے خون کی گردش تیز ہونے کے باعث انسان کا رنگ کھل جاتا ہے۔ میں نے آج اپنے صابن لگے چہرے کو غور سے دیکھا تو مجھے اپنے اوپر' خود ہی پیار آنے لگا' بیالیس برس کا ہونے کے باوجود میں کتنا خوبصورت اور سمارٹ ہوں۔ پھر دل نے کہا کہ تو ظاہری رنگ و روپ پہ کیوں جاتا ہے یہ تو عمر ڈھلنے کے

ساتھ دھوپ کی مانند ساتھ چھوڑ جاتا ہے اصل چیز جسمانی قوت ہوا کرتی ہے۔ بے ساختہ! میں نے اپنا ڈنڈ پھلا کر دیکھا تو وہاں کرکٹ کے بال کی مانند ٹھوس اور مضبوط گومڑا موجود تھا۔ میرے لبوں پر جوانی کی موجودگی کے احساس نے مسکراہٹ بکھیر دی۔ اب میں نے دوسرے ہاتھ کو موڑ کر طاقت لگائی اُس کا گومڑا پہلے ہاتھ کے گومڑے کی مانند چھوٹا اور نرم تھا لہذا میں نے زور اور بڑھایا اور گومڑے کو اُبھارنے کی کوشش میں میرا پیر پھسلا اور میں منہ کے بل اوندھا گر پڑا۔''

''سٹ لگی ہے۔''

''ہاں'' سر کی جُنبش سے۔

''زوردی لگی ہے۔'' دومرتبہ سر ہلا کر

''آ! فیر میں پٹی بَن دینی آں............''

''بُشراں نے میرے اتنے نزدیک ہو کر اپنی چُنّی سے کپڑا پھاڑ کر میری کٹی انگلی پر پٹی باندھی کہ اُس کی گرم گرم سانس میرے رُخساروں پر کٹار بن کر چلنے لگی۔ میں گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹا اور بُشراں دو قدم آگے بڑھ کر مجھے کھینچنے لگتی۔''

''اُوراں تے مر' پٹی پئی بنی آں' چھی تھوڑا پانی آں۔''

''یار دلشاد! یہ تم کس طرح کی باتیں کر رہے ہو۔ گرے باتھ روم میں تھے اور پٹی بندھوانے پہنچ گئے بشراں کے پاس۔''

''ہیلو! جی مِس افشین' میں' میں نے آپ سے کہا ہے کہ آج میں بالکل فارغ نہیں ہوں بلکہ آپ یوں سمجھیں کہ میں دفتر آیا ہی نہیں............ ہاں! یار معاف کرنا' معاملہ کچھ گڈ مڈ ہو گیا۔ اصل میں جو بات بُشراں کے حوالے سے میری زبان سے ادا ہوئی ہے یہ قریب پچیس سال پرانا واقعہ ہے۔ جب میں میٹرک میں فیل ہونے کے بعد دن بھر غلیل لے کر پرندوں کے شکار میں سرگرداں رہا کرتا تھا اور گاؤں کے اکلوتے پرچون فروش کی بیٹی بُشراں' کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھ کر سارا سارا دن میری راہ تکا کرتی تھی۔ ایک دن غلیل کی ربڑ میرے ہاتھ سے چھوٹ کر پہلی انگلی اور انگوٹھے کے درمیان واپس آ کر اس شدت سے لگی (راشد کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے) کہ کھال پھٹ گئی اور بشراں کو میرے قریب آنے کا بہانہ دستیاب ہو گیا۔ دراصل جس وقت میں باتھ روم میں گرا اور میری ٹھوڑی پر چوٹ آئی تو لمحہ بھر کو میں اپنے ماضی میں کھو گیا اور مجھے ایسا لگا کہ بشراں میرے سامنے آ کر' مجھ سے میری تکلیف کی بابت دریافت

کر رہی ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ میں بے خیالی میں بشراں کے ہر سوال پر اُسی طرح (ہاں) میں سر ہلاتا رہا جس طرح آج سے پچیس برس قبل گاؤں میں ہونے والے واقعے پر ہلایا تھا۔''

''Interesting, very very interesting'' مگر یار! یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ ہم جیسے بے تکلف اور پُرانے دوست' اس قصے سے بے خبر رہیں؟''

''بشراں نے مجھے اس لائق ہی نہ چھوڑا کہ میں اس کہانی کو دوہراسکوں یا پلٹ کر کبھی پیچھے دیکھ سکوں۔''

''اچھا! یہ بشراں کیا لفظ ہوا' بشریٰ تو سنا تھا مگر..........''

''دراصل .... مگر نہیں' مجھے اِس دفتری ماحول میں گھٹن ہونے لگی ہے۔ کہیں باہر چل کر مناسب ماحول میں گفتگو کریں گے۔''

''یار! میں صرف ایک گھنٹے کا کہہ کر گھر سے چلا تھا اور اب بارہ سے اوپر کا ٹائم ہو رہا ہے۔ پہلے گھر اور پھر دفتر فون کر دوں وگرنہ شام کو تمہاری بھابھی کے آگے میری صفائی کون پیش کرے گا؟''

''میں تو چکن کارن سوپ لوں گا۔ تم کیا لینا پسند کرو گے؟''

''ایک ہی ہلّے میں ساری حدیں پار کرنے کا ارادہ ہے جناب!'' مینو بند کرتے ہوئے راشد جمال نے بات جاری رکھی۔ ''آج کا دن تمہارا ہے اور میں تمہارے ساتھ ہوں۔ جو تم لو گے میں بھی وہی لے لوں گا۔''

''جو بھی؟''

''ہاں' ہاں بھئی .... جو بھی''

''ہاں تو تمہارا سوال یہ تھا کہ بشراں کو میں بشریٰ کہہ کر کیوں مخاطب نہیں کر رہا! .... جب بھی میں نے اُسے نون کے بغیر بشریٰ کہہ کر بلایا تو اس نے فوراً تصحیح کر کے مجھے یاد دلایا کہ اُس کا درست نام لیا کروں۔ تمہیں شائد! تجربہ نہیں کہ دیہاتوں میں تعلیم نہ ہونے کے باعث ناموں کا تلفظ اکثر بگاڑ دیا جاتا ہے اور خواتین کے نام بالعموم نذیراں' نصیراں' پھاتاں' اور کریماں جیسے اسٹائل میں رکھے جاتے ہیں۔ گاؤں کے سادہ لوح لوگ اسی کو درست تلفظ خیال کرتے اور صحیح تلفظ ادا کرنے والے کو غلط گردانتے ہیں۔''

''چھوڑو! اتنی تفصیل میں جانے کی کیا ضرورت تھی۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ بشراں کون ہے

اور اس سے تمہارا کیا تعلق ہے اور اس تعلق کو اب تک پوشیدہ رکھنے کی وجہ کیا ہے؟''

''نہیں راشد! ابھی تم نے کہا تھا کہ آج کا دن میرا ہے لہٰذا بل بھی میں ہی ادا کروں گا۔''

دلشاد عالم خان نے کوٹ کی جیب سے پرس نکالا اور بل پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے چند نوٹ نکال کر پلیٹ میں رکھے اور راشد کا ہاتھ پکڑ کر باہر کی جانب قدم بڑھا دیئے۔

''کب تک آوارہ گردی کا ارادہ ہے؟''

''اُس وقت تک جب تک میرے سینے کا بوجھ ہلکا نہ ہو جائے یا میرے دل کو قرار نہ آ جائے۔''

''آج کل بشراں کہاں ہے اور آخری بار تم اُس سے کب ملے تھے؟''

''ہاں' آں ....'' آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے۔ ''بشراں سے میری ملاقات کی ابتداء اُس وقت ہوئی! جب دلشاد عالم خان کے بجائے میں شادا ہوا کرتا تھا اور جانگیہ بنیان میں گاؤں کے کھیتوں' کھلیانوں اور گلیوں میں زندگی کے غم سے بے پرواہ' کھیل کود میں مگن رہا کرتا تھا۔ وہ اتنی گندی اور غلیظ ہوا کرتی تھی کہ اُسے دیکھتے ہی میرا دل خراب ہونے لگتا اور میں اُس کی کوشش کے باوجود نہ اُس کے ساتھ چینجو میں شامل ہوتا اور نہ لُکن مٹی (چُھپن چھپائی) میں شامل کرتا۔ ہمارا گھرانہ زمینداری اور جائیداد کے باعث گاؤں کا باعزت گھرانہ تھا۔ کمی کمینوں سے فاصلے پر رہ کر ملنا پسند کرتا تھا۔ یہی احساسِ برتری میرے اندر بھی نمایاں تھا۔ سکول میں داخلے کے بعد میری سوچ اور مشاغل اور طرح کے ہو گئے تھے مگر اُس اللہ کی بندی نے میری تمام کوششوں کے باوجود فاصلہ سمٹنے نہ دیا۔ وہ نہایت باقاعدگی سے میرے سکول جاتے وقت اور واپسی پر اپنے گھر کے سامنے کھڑی ہوتی اور دونوں ہاتھوں سے تالیاں بجا کر میرا استقبال کرتی۔ ''آہا! شادا آ گیا' شادا سکول جا رہا ہے۔ میں بھی سکول جاؤں گی اور شادے کے ساتھ پڑھوں گی۔''

''چل نی! وڈی آئی پڑھن والی' کدی ساڈے ماں' پیو نے بھی پڑھیا اے جے توں پڑھے گی۔'' ڈانٹ کر اُس کی ماں ہاتھ سے پکڑ کر اُسے اندر کھینچ لیتی اور دو جھانپڑ بھی رسید کرتی۔ مجھے دل ہی دل میں ملال ہوتا کہ بیچاری ناحق میری وجہ سے مار کھا رہی ہے۔''

''برادرِ عزیز! (گھڑی دیکھتے ہوئے) ایک ہوتی ہے کہانی' دوسرا منظر نامہ اور تیسرے نمبر پر ڈائیلاگ اگر تم نے ماضی کو تینوں فارم میں بیان کیا تو یہ سلسلہ ہفتوں پر محیط ہو جائے گا۔''

''یار! میں کیا کروں' میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا' احساسات اور خیالات کو کس طرح گرفت میں لاؤں۔''

''تم نے گاؤں کے سکول میں میٹرک تک تعلیم حاصل کی ہے۔ گفتگو کا سلسلہ اب وہاں سے شروع کرو۔''

''ہوں .... ہاں .... وہ تو میرے آٹھویں جماعت میں پہنچنے تک یکسر بدل چکی تھی۔ رنگ روپ، قد کاٹھ اور اُس کی شرارتیں گاؤں کے ہر گھر کا موضوع بن چکی تھیں۔ بلا کی نڈر، بے باک اور ہوشیار ہوگئی تھی۔ حالانکہ ابھی میری مَسیں بھی ٹھیک سے نہیں بھیگی تھیں مگر اُسے دیکھتے ہی میری کیفیت یکسر بدل جاتی۔ الفاظ زبان پر اٹک اٹک کر آتے اور سانس بے ترتیب ہو جاتی۔ میری خواہش ہوتی کہ وہ مجھے دیکھ کر شرمائے، لجائے اور میری جانب سے محبت کے دو بول سننے کی منتظر رہا کرے مگر وہ تو مجھے دیکھتے ہی بے قابو ہو جاتی اور پل بھر میں ساری حدیں پار کرنے کی ترغیب دینے لگتی۔ جس سے میرے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو جاتے اور میں پسینے میں اس طرح شرابور ہو جاتا جیسے میلوں دوڑ کر آ رہا ہوں۔''

''اصل قصّے کی طرف آؤ، اصل قصّے۔''

''ہاں .... وقت کافی ہو گیا ہے (گھڑی دیکھتے ہوئے) کیا خیال ہے! کہیں بیٹھ کر ایک کپ چائے کا نہ پیا جائے۔ مجھے بڑی طلب ہو رہی ہے۔''

ہاں! یہ تم نے اچھی بات کی مگر گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے۔''

''بس یار .... (چائے کی چُسکی لے کر بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے) میرا میٹرک میں فیل ہونا اُس کی بربادی کا سبب بن گیا۔ گھر والوں بلکہ گاؤں والوں کو بھی ہماری بابت چہ مگوئیاں کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ میرے فیل ہونے کی ذمہ داری بشراں کے سر تھوپی جا رہی تھی۔ ایک رات اچانک والد صاحب اور دونوں چچا مجھے گاڑی میں بٹھا کر شہر لے آئے اور صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا ''اگر ہماری اجازت کے بغیر تم نے گاؤں کا رخ کیا تو ہم اُس نیچ ذات پرچون فروش کی بیٹی کے سینے میں گولی اُتار دیں گے۔ ضرورت پڑی تو ہم اپنی عزت کی خاطر تمہیں بھی مارنے سے دریغ نہیں کریں گے۔''

''واہ بھئی واہ! میں تو تمہیں اور تمہارے خاندان کو بہت مہذب سمجھتا تھا۔''

''ایک ماہ بڑے تذبذب اور بے چینی میں گزرا، اچانک ایک رات میرے کمرے کا دروازہ (Knock) ہوا۔ سامنے کمّو نائی کھڑا تھا۔ جس کا اصلی نام تو کمال الدین تھا۔ گاؤں والوں نے مختصر کر کے کمّو کر دیا تھا۔ وہ ہر ماہ شہر کریم، پاؤڈر خریدنے اور قینچی، اُسترے تیز کرانے آیا کرتا تھا۔ کمّو نے کانپتے ہاتھوں جیب سے ایک تڑا مڑا رقعہ نکال کر میری جانب بڑھا دیا۔''

''یہ کیا ہے کمو؟''

''شادا بھائی آپ خود پڑھ لو۔''

''تمہیں گاؤں سے گئے ہوئے آج پورے اُنتیس دن ہو گئے ہیں اور کل پورا مہینہ ہو جائے گا۔ جس دن سے تم گئے ہو۔ کھانا' پینا' منجی' بسترا' کھیل کود' سکھی' سہیلیاں اور گاؤں کے گلی چوبارے' اجنبی اور بیگانے لگنے لگے ہیں یا تو تم فوراً آ کر مجھے لے جاؤ یا کہو تو میں خود تمہارے پاس آ جاؤں۔ میرے لئے تمہارے بغیر جینا حرام ہے۔ اگر تم نے اپنے آنے یا مجھے بُلانے کی خبر نہیں بھیجی تو یاد رکھنا میں زہر کھا کر جان دے دوں گی۔''

''پاگل ہو گئی ہے .... یہ خط .... یہ خط کس سے لکھوایا ہے۔ بشراں تو چٹی ان پڑھ ہے۔''

''شادا بھائی! یہ اُس نے لطیف سنار کی بیٹی سے لکھوایا ہے۔ بڑی پکی سہیلیاں ہیں دونوں' آٹھ جماعتاں پڑھی ہے لطیف سنار کی بیٹی صغراں۔''

''نہیں' نہیں یہ غلط ہے .... میرا اور بشراں کا کیا تعلق؟ اُس سے کہنا بے وقوفی چھوڑ دے اور اِس طرح کی فلمی باتیں نہ کرے اور نہ آج کے بعد مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش کرے۔''

''کیا واقعی تمہارے دل میں بشراں کے لئے کوئی جگہ نہ تھی؟''

''کم از کم اُس وقت میرا یہی خیال تھا۔''

''اور اب؟''

''بیالیس برس کی عمر تک کنوارہ رہنا ہی میرا جواب ہے۔''

''ارے ہاں! یہ بتاؤ آج کل بشراں کہاں اور کس حال میں ہے؟''

''چھوڑ' چلتے ہیں۔ دن غروب ہو گیا۔ کہانی ختم ہو گئی۔''

''یار! یہ تو ظلم ہے' مجھے ساری رات نیند نہیں آئے گی۔ تمہیں بشراں کی بابت بتانا ہو گا وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔''

''وہ وہیں ہے جہاں آج سے پچیس سال پہلے گئی تھی .... یقیناً آرام سے ہو گی۔''

''دلشاد! تیرے چہرے کی سیاہی کا تعلق اُس کی دھمکی سے تو نہیں؟''

''شائد ہاں ....''

''Oh my God'' تُو نے اپنی زندگی کی اتنی بڑی ٹریجڈی ہم سے کیوں چھپائے رکھی۔''

''اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔''

''تُو گیا تھا اُس موقع پر.........؟''

''میں نے تو پچیس سال سے گاؤں کی طرف مُڑ کر بھی نہیں دیکھا اور شائد مرتے دم تک نہ دیکھوں۔''

''تو پھر آج اچانک یہ تبدیلی کیوں..........؟''

''راشد بات یہ ہے کہ میں آج پچیس سال گزرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں' انسان کو کوئی کام' عشق' محبت' نفرت' دشمنی' دوستی' کاروبار ادھورا نہیں کرنا چاہئے لہذا میں نے اب خود کو مکمل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔''

''سچ! اگر یہ بات ہے تو میں آج کے دن کو اپنے لئے خوش نصیب دن سے تعبیر کروں گا اور مجھ سے جو بھی بن پڑا ہر صورت کروں گا۔ تمہیں مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا! میں تمہارے لئے جو بہتر سمجھوں گا تم اُس سے انکار نہیں کرو گے۔''

''وعدہ' میرے دوست پکا وعدہ' میں نے آج سے اپنی زندگی کی ڈور تمہیں سونپ دی ہے''

''اگر ایسا ہے تو پھر نیک کام میں دیر کیسی؟ چلو' اٹھو۔''

''جیسے تمہاری مرضی۔''

''ایک منٹ صرف ایک منٹ گاڑی روک کر تم میرا انتظار کرو میں ابھی آیا۔'' پانچ منٹ بعد راشد واپس آیا تو اُس کے ہاتھ میں بڑا' خوبصورت اور خوشنما پھولوں کا ''بوکے'' تھا۔ کچھ دُور گاڑی چلنے کے بعد راشد نے پھر گاڑی رکوائی۔ پھر پانچ منٹ رکنے کا کہا واپسی پر راشد کے ہاتھ میں قیمتی کاغذ میں ملفوف ایک پیکٹ نظر آرہا تھا جس کے بعد راشد نے دلشاد کو چلنے کا اشارہ کیا اور کچھ فاصلے پر پھر گاڑی روکنے کی ہدایت کی۔ راشد پھر دلشاد سے پانچ منٹ کی اجازت لے کر گیا اور پھر اس کے ہاتھ میں نفیس ریپر میں کوئی پیکٹ نما چیز نمایاں تھی۔ اس کے بعد راشد نے گاڑی میں بیٹھ کر دلشاد سے سگریٹ کی ڈبی طلب کی اور اُس میں سے دو سگریٹ نکال کر ایک ساتھ سلگائے ایک اپنے ہونٹوں میں دبا کر لمبا کش لیا اور دوسرا دلشاد کے ہونٹوں میں دبا کر شہر کی پوش آبادی کی جانب چلنے کا اشارہ کیا۔ قریب بیس منٹ کی مسافت کے بعد ایک سرسبز و شاداب اور جدید ڈیزائن کے گھر کے آگے گاڑی روک کر دلشاد کو زور سے ہارن بجانے کا کہا جس کے جواب میں ایک لمبا تڑنگا مونچھوں والا شخص برآمد ہوا۔ جس سے رسمی علیک سلیک کے بعد راشد نے جیب سے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر اُسے تھما دیا۔ کچھ دیر بعد وہ

شخص لوٹا تو اُس کے انداز میں خاصی عاجزی اور انکساری آ گئی تھی اُس نے ادب سے گھر کا گیٹ کھول کر گاڑی کو اندر آنے کا اشارہ کیا اور تیزی سے گیٹ بند کر کے ڈرائنگ روم کی جانب رہنمائی کرنے لگا۔

گھر کی اندرونی سجاوٹ صاحب خانہ کی سلیقہ مندی اور اعلیٰ ذوقی کو نمایاں کر رہی تھی جس سے مرعوب ہوتے ہوئے دلشاد عالم خان نے دھیمی آواز میں صاحب خانہ کی بابت دریافت کرنا چاہا۔ ہاتھ کے اشارے سے راشد جمال نے اپنے دوست کو خاموش رہنے اور انتظار کرنے کی تاکید کی .... انتظار کے چند لمحے دلشاد عالم خان پر کافی گراں گزرے ۔تھوڑی ہی دیر میں یہ گرانی روح وقلب کی تازگی میں تبدیل ہوگئی۔ اچانک کمرے کی روشنی اور دیدہ زیبی دو چند ہوگئی۔

''ان سے ملئے! یہ دلشاد عالم خان اور شہر کے مشہور قانون دان ہیں۔ سب سے اہم بات یہ کہ مجھے ان سے بے تکلف دوستی کا شرف حاصل ہے۔''

''آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی مِس نیلم نے دلشاد عالم خان کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا۔''

''معافی چاہتا ہوں مِس نیلم آپ کو بے وقت زحمت دی مگر اِس وقت آپ کی جتنی ضرورت میرے دوست دلشاد عالم کو ہے اُس کے مقابلے میں کسی چیز کی کوئی اہمیت نہیں۔ یار! اتنی بدذوقی کا مظاہرہ نہ کرو (دلشاد عالم کی طرف رخ پھیرتے ہوئے) شہر کی مشہور و معروف' عظیم ترین اور حسین ترین ہستی' مس نیلم کا ہاتھ تمہاری جانب بڑھا ہوا ہے اور تم؟۔''

''معاف کیجئے گا (جیب سے رومال نکال کر اُلٹے ہاتھ سے پسینہ پونچھتے ہوئے سیدھا ہاتھ مس نیلم کی جانب بڑھایا) دراصل میں..........''

''ارے نہیں' نہیں ایسی کوئی بات نہیں مس نیلم' اعلیٰ ذوق اور رکھ رکھاؤ والی خاتون ہیں۔ یہ تو اِن کی محبت ہے کہ انہوں نے بے وقت آمد پر خوش آمدید کہا وگرنہ شہر کے بڑے بڑے لوگ ان کی قربت کو ترستے ہیں .... آپ اجازت دیں تو میں گاڑی سے کچھ چیزیں لے آؤں۔'' واپسی پر بوکے اور دونوں پیکٹ راشد کے بجائے مس نیلم کا ملازم لے کر آیا۔ جنہیں مس نیلم نے کھول کر دیکھا اور دلشاد عالم خان کے اعلیٰ ذوق کی داد اس طرح دی کہ اُن کے ساتھ بالکل نزدیک ہو کر بیٹھ گئیں۔ دلشاد عالم خان کچھ کہنا چاہتے تھے کہ الفاظ کانٹے بن کر ان کے حلق میں پھنس کر رہ گئے۔ انہوں نے تھوڑا سا کھسک کر جیب سے رومال نکالا اور پسینے

سے تر پیشانی کو خشک کرنے لگے۔

''اللہ! آپ کو اتنے پسینے کیوں آ رہے ہیں۔ ٹائی کی ناٹ تو ڈھیلی کیجئے نا! مس نیلم آگے بڑھ کر اپنے نرم و ملائم ہاتھوں سے دلشاد عالم خان کی ٹائی ڈھیلی کرنے لگیں جس کے دوران اُن کا آنچل شانے سے ڈھلک گیا اور اُن کے سانسوں کی تپش دلشاد عالم خان کو اپنے رخساروں پر محسوس ہونے لگی۔ یکا یک دلشاد عالم خان صوفے سے اُچھل کر کھڑے ہو گئے اور اپنی گیلی قمیض کے بٹن اور ٹائی کی ناٹ درست کرتے ہوئے بولے'' آپ خفا نہ ہوں تو میں اجازت چاہوں گا'' یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے دلشاد عالم خان نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر پرس نکالا اور مس نیلم کی طرف بڑھاتے ہوئے معذرت خواہانہ نظروں سے اجازت طلب کرنے لگے۔ کچھ دیر کے لئے مس نیلم کے چہرے پر حیرت' پریشانی اور ندامت کے آثار نمودار ہوئے جلد ہی خود پر قابو پاتے ہوئے مس نیلم نے کہا۔

''آپ درست سمجھے خان صاحب! یقیناً اِسی پیسے کے لئے ہم نے یہ عالیشان دکان سجائی ہوئی ہے افسوس ......! یہاں خوبصورت چہرے تو دستیاب ہیں اُن کی روحیں مُردہ ہو چکی ہیں ......آپ کے لائے ہوئے تحفے زندہ انسانوں اور زندہ روحوں کے لئے ہیں ......آپ کا عنایت کردہ پرس میں رکھے لیتی ہوں .... برائے مہربانی اپنے لائے ہوئے پھول' خوشبو اور کتاب لے جایئے اور کسی زندہ ضمیر کی نظر کر دیجئے ....''

کچھ دیر کے لئے دلشاد عالم خان گومگو اور سکتے کے عالم میں رہے .... خاموشی سے باہر آ کر اپنے لائے ہوئے پھول' خوشبو اور کتاب ساتھ والی فرنٹ سیٹ پر رکھے اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر اطمینان سے گاڑی کو اسٹارٹ کیا ....ذرا توقف کے بعد گاڑی کو ریورس کر کے مین روڈ پر لے آئے جہاں سے کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد دلشاد عالم خان کی گاڑی ایک ناہموار سڑک پر مُڑ کر فرّاٹے بھرنے لگی ....!!!

دلبر صحرائی

سیڑھیوں کی رنگت' چوڑائی' موٹائی اور تعداد پہلے جیسی تھی۔ ہمیشہ کی مانند روشنی کی مقدار بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔ جس طرح پہلے یہاں ویرانی برستی تھی اُسی طرح آج بھی اُلو بول رہے تھے۔ سیڑھیوں کا فاصلہ اور ماحول' بہت مانوس تھے۔ اُس کی زندگی کے بہت سے خوبصورت' سنہری ایام کی یادیں انہیں سیڑھیوں سے وابستہ تھیں۔ سیڑھیوں پر چڑھنے اور اُترنے کی اُسے اتنی عادت ہوگئی تھی کہ آنکھوں پر پٹی باندھ کر بھی وہ ایک ردھم اور مخصوص وقت میں سیڑھیوں کا فاصلہ طے کر سکتا تھا۔ آج! جس سرعت اور پھرتی سے اس نے سیڑھیوں کا فاصلہ طے کیا تھا اس سے چہرے کا رنگ سرخ اور دل کی دھونکنی کافی تیز ہوگئی تھی مگر---- تکلیف کے آثار نظر آنے کے بجائے جوش اور ولولہ کی کیفیت نمایاں تھی۔

وقت سے پہلے کسی تقریب میں پہنچنے کا اس کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ جس کے باعث' یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ خوشی کی کیفیت سے دوچار ہے یا گھبراہٹ کے زیراثر یہ حادثہ سرزد ہوگیا ہے۔ خلاف توقع' بال سلیقہ سے بنے ہوئے' تازہ خضاب کی سیاہی اور چمبیلی کے تیل کے ساتھ بھینی بھینی خوشبو بھی اُس کے چاروں اُور پھیلی ہوئی تھی۔ چھاتی کے سفید بالوں سے عمر کا اندازہ لگانا ممکن نہ تھا۔ گریبان کے بٹن' جیل کے پھاٹک کی مانند سختی سے بند تھے اور پہرے دار کی شکل میں اُس پر نکٹائی کی حکمرانی تھی۔ چوں چراں کی میوزیکل آواز کے حامل کوہاٹی سینڈل کی جگہ' لش لش کرتی نئی گرگابی نے دونوں پیروں کو' موچی کے جمبور کی مانند

گرفت میں لیا ہوا تھا جس کے باعث اس کی چال میں اٹھک بیٹھک والا ردھم ندارد تھا۔ سنبھل سنبھل کر سوچ سوچ کر قدم بڑھاتا اور چہرہ پر مصنوعی مسکراہٹ سجا کر اُس تکلیف کو چھپانے کی کوشش کرتا جو پیروں کو نئے جوتے کی تنگی کے باعث برداشت کرنا پڑ رہی تھی۔

ہال میں داخل ہو کر وہ کچھ ٹھٹکا۔ ہال کی فضا' کچھ بدلی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ گرد و پیش پر نظر ڈال کر اُس نے تسلی کرنا چاہی' سب کچھ اپنی جگہ ویسا ہی تھا جیسا ہر تقریب سے قبل ہوا کرتا تھا۔ چاروں کونوں کا طواف کرتی نگاہ' سامنے لگی کرسیوں کی قطار پر ٹھہر گئی۔ خاص مہمانوں کے لئے' اگلی رو میں پڑے صوفوں کے علاوہ کل پانچ قطاریں تھیں۔ ہر قطار میں' دس کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ انگلیوں کو گھما کر' کرسیوں کی تعداد شمار کرنے کے بعد' گنتی پچاس پر جا کر ٹھہر گئی۔ چہرہ پر بدمزگی کے آثار نمایاں ہوئے' بل زدہ پیشانی پر چند سلوٹیں اور نمایاں ہو گئیں۔ بے چینی' بے قراری کی کیفیت میں' کلائی پر بندھی' ویسٹ اینڈ واچ کو غور سے دیکھ کر وقت کا اندازہ لگایا۔ مقررہ وقت سے نصف گھنٹہ اوپر ہو چکا تھا اور وہ' مہمانوں کی صورت کو اس طرح ترس رہا تھا جس طرح جوانی کے ایام میں' ایک کپ چائے یا سگریٹ کے ایک کش کو ترستا تھا۔

یکا یک! خیالات کا دھارا پریس فوٹو گرافر کی جانب' گھوم گیا۔

گزشتہ ایک ہفتہ سے' نہ جانے کتنی بار' اُس کے گھر کے چکّر لگا کر تقریب کے دن' وقت اور مقام کی بابت یاد دہانی کرائی تھی۔ ہر بار اُس نے مقررہ وقت پر پہنچنے کا پکا یقین دلایا تھا۔ کمبخت کہیں کا! تصویر نہیں کھینچنی تھی' بیشک! نہ کھینچتا' کم از کم کیمرہ تو گھما جاتا' بھلے ہی رِیل کے بغیر عین' انور حسرت اور محمود کی طرح' جب انہوں نے ایامِ شباب میں اُس کے فلمی جنون کو دیکھتے ہوئے' بھرے بازار میں خالی کیمرہ گھما کر' ہیرو بنانے کے عوض' اُسے دونوں ہاتھوں سے لوٹنے کی کوشش کی تھی۔ جس کے بعد' دوستوں اور رشتہ داروں میں بھرم برقرار رکھنے کے لئے اُس نے ذاتی فلم شروع کر ڈالی تھی جہاں' ہارون شاہ کے بھیس میں' انور حسرت اور محمود' پہلے سے موجود تھے۔

انور حسرت اور محمود کے واقعے نے' پریس فوٹو گرافر کی گلو خلاصی کر دی تھی۔ اُس کی جگہ' مایوسی نے غلبہ پا لیا تھا جس کے زیرِ اثر' ایک ایک کر کے اُن دوستوں اور بہی خواہوں کی شبیہیں اُبھرنا شروع ہو گئیں۔ جنہیں' اُس نے خود جا کر دعوت نامے دیئے۔ پُرانے تعلق اور اپنی خدمات کے عوض تقریب میں آنے کی تاکید بلکہ درخواست کی تھی۔ اُن کی غیر حاضری کی

صورت میں ناراضگی کی دھمکی دینا بھی نہ بھولا تھا۔

ایک بار پھر' اُس کے چہرے کی کیفیت بدلی۔ اِس بار' اُس کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی جس میں خوشی کی نسبت حقارت کا عنصر نمایاں تھا۔ غیر ارادی طور پر' دایاں ہاتھ پتلون کی سائیڈ پاکٹ میں کچھ تلاش کرنے لگا۔ تھوڑی کوشش کے بعد سگریٹ کی بیش قیمت ڈبی برآمد ہوگئی جس کے اندر' اُس کے مخصوص اور کڑک برانڈ کے سگریٹ' بے ترتیبی سے ٹھنسے ہوئے تھے۔ ایک سگریٹ نکال کر' سگریٹ کی ڈبی پر فلٹر والی سائیڈ اور تمبا کو والی طرف سے سگریٹ کو بار بار ٹھونک بجا کر' تمبا کو والی سمت کو زبان پر پھیرتے ہوئے گیلا کیا اور جب فلٹر والے سرے کو ہونٹوں میں دبا کر پتلون کی بائیں جیب سے ہاتھ باہر نکالا تو چم چم کرتا' سگریٹ لائٹر اُس کے ہاتھوں میں تھا جس کے تیز اور روشن فلیم سے سگریٹ سُلگا کر' دھوئیں کے گاڑھے' لچھے دار مرغولے فضا میں بکھیرنے لگا۔

کہنیوں کے بل' پیچھے کھلنے والی کھڑکی میں منہ لٹکائے' باہر کا نظارا بہت بھلا لگ رہا تھا۔ سگریٹ کے دھوئیں سے پھیپھڑوں میں ہونے والی سوزش' تازہ ہوا کے ذریعے' کسی قدر کم ہو رہی تھی اور طبیعت میں ٹھہراؤ آ رہا تھا۔ وقت' دبے پاؤں مخالف سمت گامزن ہو گیا۔

''نہیں' نہیں کل کیوں؟ میں آج ہی سنوں گا بلکہ ابھی سنوں گا۔ آپ روز' کل پر ٹال دیتی ہیں''۔ پانچ سے چھ سال کی عمر کا' سرخ سپید' گول مٹول بچہ اپنی دادی کی گود میں بیٹھا' لال پری کی کہانی سننے کی ضد کر رہا تھا۔ پہلی بار! دادی نے اُسے لال پری کی کہانی سنائی تو اُسے' اتنی اچھی لگی کہ وہ ہر روز لال پری کی کہانی سننے کی ضد کرنے لگا۔ دادی کو لال پری کی صرف ایک کہانی یاد تھی۔ وہ' روز روز کہاں سے' بچے کی ضد پر لال پری کے نئے قصے ڈھونڈ کر لاتیں۔

لال پری' ہر رات شہزادے کو آسمانوں کی سیر پر لے جاتی' خوبصورت محلوں' باغوں ' دریاؤں' آبشاروں کی سیر کراتی۔ طرح طرح کے میوے کھلاتی اور گھنٹوں اپنی حسین ہمجولیوں کے ہمراہ طرح طرح کے کھیل کھلاتی۔ لال پری کی سہیلیاں اکثر شہزادے کی بابت لال پری سے دریافت کرتیں تو لال پری شہزادے کی جانب دیکھ کر' شرما جاتی۔ کھلکھلا کر ہنسنے کے سوا کوئی جواب نہ دیتی۔ شہزادہ صبح سو کر اٹھتا تو اس کا اپنی مملکت میں دل نہ لگتا۔ محل کی شہزادیاں' کنیزیں اور خادمائیں اُسے بھونڈی اور بدصورت نظر آتیں۔ لال پری اور اُس کی سہیلیوں کے حسین و دلکش چہرے دن بھر اُس کا احاطہ کئے رکھتے۔ شہزادہ بے چینی' بے قراری

سے رات کا انتظار شروع کر دیتا اور لال پری سے ملاقات کی آرزو میں سرِ شام ہی سونے کے کمرے میں چلا جاتا جہاں سکون ہی سکون' اطمینان ہی اطمینان اور راحت ہی راحت اُس کے منتظر ہوا کرتے تھے۔

ایک دن' بچے کو شرارت سوجھی اور اُس نے دادی کو آزمائش میں مبتلا کر دیا۔

''آپ روز' روز جنوں اور پریوں کی کہانی کیوں سناتی ہیں؟ انسانوں کی کہانیاں' آپ کو نہیں آتیں کیا؟''

''نا میرے لال نا! خدا میری زندگی میں وہ دن کبھی نہ لائے کہ میں' اس کے بندوں کی بدخوئی کروں؟''

''بدخوئی کیا ہوتی ہے دادی؟''

''پیٹھ پیچھے انسانوں کی برائی کو' بدخوئی کہتے ہیں۔''

''آپ! برائی نہ کریں نا! اچھی اچھی کہانیاں سنائیں!''

''آ............ ہا............ بیٹا! اب میں آپ کو کس طرح سمجھاؤں' اچھے انسانوں کا' کال ہونے کی وجہ سے اچھی باتیں اور سچے قصے ناپید ہو گئے ہیں۔''

''چھوڑیں دادی! آپ اچھے بُرے کے چکر میں کیوں پڑتی ہیں۔ بس مجھے کہانی سنائیں۔''

''توبہ' توبہ کرو بیٹا! اللہ میاں سے توبہ کرو۔ پتہ ہے! پرانے وقتوں کے لوگ بھی اسی طرح کی باتیں کیا کرتے تھے' انہیں اللہ میاں نے بہت سخت سزا دی تھی۔''

پُرسکون وپُرلطف تصوراتی سلسلہ' قدموں کی دھم دھم سے منقطع ہو گیا۔ مہمانوں کی آمد کے خیال سے' ادھ جلا سگریٹ' زمین پر پھینک کر' پیر سے مسلتے ہوئے' دونوں ہاتھوں سے سر کے بال درست اور چہرہ پر مسکراہٹ سجائے ہوئے' استقبالی انداز میں قدم بڑھائے۔ سنا ہے! پہلے مہمان کا قدم' مبارک ہوتا ہے۔ جس طرح سیڑھیوں کی دھمک عارضی تھی اُسی طرح اُس کی خوشی بھی عارضی ثابت ہوئی۔ جس شخص کو مہمان سمجھ کر' اُس کا دل بلیوں اُچھلنے لگا تھا وہ متعلقہ محکمہ کا ملازم! دفتر ہذا کا چپڑاسی تھا' شکل سے بیمار اور زمانے کا ستایا لگتا تھا۔

''سنو! کیا نام ہے تمہارا............ ایک گلاس پانی مل جائے گا۔''

گرچہ پانی کی اُسے طلب نہ تھی مگر گلے میں چبھنے والی پھانسوں کا علاج بھی ضروری تھا۔ پانی کے چند گھونٹ حلق سے اتارنے کے بعد' طبیعت میں پائی جانے والی بے چینی دور ہونے لگی۔ چند ڈکاریں لینے کے بعد اُسے بشاشت کا احساس ہوا اور خود بخود' اُس کی زبان

سے الفاظ تشکر ادا ہونے لگے۔

''اور تم اپنے رب کی' کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے۔''

روشنی کے بلب' بجلی کے پنکھے' روسٹرم اور صوفوں کا' پھر سے جائزہ لینے کے بعد اس کی توجہ کا مرکز' پانچ قطاروں میں لگی' پچاس کرسیاں تھیں۔ دس ضرب پانچ برابر پچاس۔ یہ تو بہت معمولی تعداد ہے۔ اخبارات میں تصاویر دیکھ کر' لوگ باگ ضرور' چہ میگوئیاں کریں گے۔ کچھ دیر یکسوئی سے سوچنے کے بعد ہر قطار میں سے تین کرسیاں الگ کر کے' پانچ کی تعداد کو سات تک پہنچا دیا' یعنی اب سات ستے انچاس' ایک لائن کے اضافہ کی' دل میں ابھی بھی خواہش تھی جبکہ کرسی ایک بچتی تھی۔ بچ رہنے والی کرسی کو آخری قطار میں لگا کر' کرسیوں کی جانب پشت کر کے اب وہ ڈھیلا کھڑا ہو گیا اور دائیں' بائیں دیکھتے ہوئے' پیر ہلا کر گنگنانے کی کوشش کرنے لگا۔ ہاتھ کی صفائی سے' چپڑاسی کو بے خبر رکھنا اُس کی مجبوری تھی۔ ایک بار پھر اُس کی توجہ کا مرکز پانی کا گلاس تھا جس میں ابھی پانی موجود تھا۔ باقی کا پانی پی کر' حسب عادت' بے خیالی میں' آستین سے ہونٹ خشک کئے اور سگریٹ سلگا کر پھر سے کھڑکی کے باہر کا نظارا کرنے لگا۔

''دادی جان! بتائیں نا' کیا سزا دی تھی اللہ میاں نے پُرانے لوگوں کو اور کیوں دی تھی؟''

''اچھا یہ بتاؤ! ہم لوگ انسان بننے سے پہلے' کیا تھے؟''

''ہم .... انسان بننے سے پہلے کیا تھے .... ہم انسان بننے سے پہلے' حیوان تھے۔ ہماری مِس نے ہمیں بتایا ہے کہ ہماری شکل' پہلے بندر اور لنگور کی طرح ہوتی تھی۔''

''شاباش! پہلے زمانے میں جب اچھے لوگوں کا' کال پڑنے لگا تو انہوں نے اپنے باپ' دادا' عزیز رشتہ داروں کی بہادری' شجاعت اور فیاضی کے جھوٹے قصے گھڑنا شروع کر دیئے جوان کے مخالف تھے انہوں نے' ان سے بڑھ کر اپنے بزرگوں کی جھوٹی تعریفیں کرنا شروع کر دیں۔ اس طرح سے پہلے مقابلے پھر دشمنی کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ اب وہ لوگ' ایک دوسرے کے بزرگوں' دوستوں اور رشتہ داروں کی برائیاں بڑھا چڑھا کر بیان کرنے لگے اور طرح طرح کی بہتان تراشی کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ جب اُن لوگوں نے جھوٹ اور کذب بیانی کی انتہا کر دی تو اللہ تعالی نے اپنے نیک بندوں کے ذریعے انہیں اس عمل سے' باز رہنے کی تنبیہ کی۔ ان لوگوں پر اللہ اور اس کے نیک بندوں کی ہدایت کا کوئی اثر نہ ہوا تو اللہ تعالی نے انہیں اپنے عذاب سے ڈرایا پھر بھی وہ لوگ باز نہ آئے تو' اللہ تعالی نے' انہیں بری باتوں سے روکنے

کے لئے سامانِ عبرت بنا دیا۔

''کیا بنا دیا ...... دادی؟''

''بھئی! اُن کی شکلیں بدل دیں۔ جسم تو ان کے انسانوں کی طرح کے رہ گئے اور شکلیں پھرسے' بن مانس' چمپنزی' بندر' لنگو جیس کر دی گئیں تاکہ انہیں دیکھ کر دوسرے لوگ عبرت حاصل کریں۔ جھوٹ' کذب بیانی اور دروغ گوئی سے توبہ کرلیں۔''

''آہ ...... ہا ...... آج تو بڑے چمک رہے ہو میاں! کیا عقد ثانی کا ارادہ ہے؟'' یہ شہر کے سکہ بند' ادیب' شاعر اور نقاد تھے اور ایک ادبی دھڑے کی سربراہی کا بار بھی اٹھائے ہوئے تھے۔ آج کی تقریب کے دولہا کی' تراش خراش اور ادبی قد' کاٹھ کا سہرا ان ہی کے سر باندھا جاتا ہے جس کے عوض گزشتہ تین دہائی سے' یہ بے چارہ' جب بھی قلم اٹھاتا بزرگ مذکور کی مدح سرائی کا قرض ضرور ادا کرتا ہے۔ اس کے نزدیک' بزرگ سے بڑا ادیب' شاعر اور نقاد' اس ملک میں تو کیا صفحۂ ہستی پر موجود نہیں اور بزرگ کی بدقسمتی کہ وہ اتنے بونے لوگوں کے درمیان پیدا ہو گئے وغیرہ وغیرہ ......

''بھئی معاف کرنا! ذرا تاخیر ہو گئی۔ دراصل' دفتر میں بڑی اہم میٹنگ تھی۔ فارن ڈیلی گیشن آیا ہوا ہے۔ بڑی مشکل سے وقت نکال کر آیا ہوں۔ پہلے مجھے پڑھوا دیجئے گا۔ میں نے فارن ڈیلی گیشن کو پانچ ستارہ ہوٹل میں ڈنر دینا ہے۔'' یہ ایک سرکاری افسر تھے جن کی بابت مشہور تھا کہ انہیں دانشور کے ساتھ شاعر کہلانے کا بڑا شوق ہے اور آج کی تقریب کے میزبان نے انہیں کئی کتابیں' اپنے قلم سے تحریر کر کے دی ہیں جو افسر مذکور نے اپنے نام سے چھپوا کر' خوب پبلسٹی حاصل کی ہے۔ ہر کتاب کی تقریب رونمائی میں' میزبان موصوف نے' افسر صاحب کی شان میں وہ تمام الفاظ' القاب پڑھ ڈالے ہیں جو ڈکشنریوں اور لغتوں میں دستیاب ہیں۔ سنا ہے موصوف کی نوکری انہیں افسر صاحب کے طفیل لگی تھی اور ترقیاں بھی ان ہی کی مرہونِ منت ہیں۔ آج کل اپنے صاحبزادے کے لئے وظیفہ کے چکر میں ہیں تاکہ اُسے اعلیٰ تعلیم کے لئے بیرون ملک بھیجا جا سکے۔

''اسلام علیکم ...... اسلام علیکم ...... معاف کیجئے گا ہمیں کچھ تاخیر ہو گئی۔ وہ ذرا ہمارے گھر کچھ مہمان آ گئے تھے۔ وزیر صاحب کا اصرار تھا کہ ہم اُن کے بیٹے کی دعوتِ ولیمہ میں ضرور شرکت کریں۔ ہم نے بہت کوشش کی' بہت جان چھڑائی مگر وزیر صاحب اٹھنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ بس ایک ہی اصرار' ہمیں بلانے کا کئے جا رہے تھے ...... چار و ناچار

ہم نے وزیر صاحب کے بیٹے کے ولیمہ میں شرکت کی دعوت قبول کر ہی لی وگرنہ ہم آج کی تقریب سے محروم ہو جاتے۔'' ڈھلتی عمر میں بھی موصوفہ کو ننھی کا کی بننے کا بڑا شوق ہے بات بات پر اٹھلانا اور شرمانا کبھی نہیں بھولتیں۔ شوہر سے علیحدگی کے بعد' شادی نہ کرنے کے وعدہ پر' عدالت نے تینوں بچے خاتون کی تحویل میں دے دیئے ہیں۔ شوہر سے علیحدگی کے دس سالوں میں' آج کا میزبان' چوتھا شکار ہے جس کے ساتھ محترمہ کا نام غیر اعلانیہ طور پر نتھی کیا جاتا ہے۔ محترمہ کی بلند آہنگی میں چاروں درویش کا برابر حصہ بتایا جاتا ہے۔ ہر درویش نے پہلے کو چت کرنے کی غرض سے محترمہ کی شان میں ایسے ایسے قصیدے کہے اور بیان کئے ہیں کہ کانوں کو ہاتھ لگانے سے' توبہ پوری نہیں ہوسکتی۔

وعلیکم اسلام............مہربانی.....شکر ہے جی خدا کا......آپ کیسے ہیں؟ بس جی کیا سنائیں ہماری تو جان پر بنی ہوئی ہے۔ عوام کیا' حکومت کیا' سرکاری افسر کیا' اور تو اور آپ ادیب' شاعر بھی ہمارے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ ہر طرف کرپشن' کرپشن کا راگ الاپا جا رہا ہے۔ کہاں ہے کرپشن..........ہمیں تو دکھائی نہیں دیتی..........آپ کو دکھائی دیتی ہے تو صرف سیاستدانوں میں؟ کبھی آپ نے ہمارے خرچے دیکھے ہیں؟ ہمارے ڈیروں کے روزمرّہ اخراجات کا تخمینہ لگایا ہے؟ الیکشن پر اُٹھنے والی رقم کی بابت غور کیا ہے؟ تحفوں اور نذرانوں کی مد میں جانے والی گڈیوں کو گنا ہے؟ میرے خیال میں اس وقت ہمارے ملک میں سب سے قابلِ رحم مخلوق سیاستدان ہیں۔'' ملک مہربان الیکشن میں ہار کا سارا غصہ آج ہی اتارنا چاہتے تھے۔ انہیں آج کی تقریب کا مہمان خصوصی بنایا ہی اس لئے گیا تھا کہ وہ اپنی باری پر' ہر کس و ناکس کی خبر لیں گے اور جی کھول کر لیں گے۔ بقول اُن کے یہ اُن کی زندگی کا مہنگا ترین الیکشن تھا جو وہ اپنے ورکروں کی ناقص کارکردگی کے سبب ہار گئے۔ ورکروں کی ناقص کارکردگی کا ذکر کر کے' ایک طرح سے ملک مہربان نے آج کی تقریب کے میزبان کی بھدّ بھی اُڑائی تھی کیونکہ وہ اُن کا پس پردہ' پروپیگنڈہ سیکریٹری اور تقریر نویس تھا۔ نان میٹرک ملک مہربان کو قومی سطح کا سیاستدان' مدبر اور دانشور بنانے میں اُس نے اپنی تمام توانائیاں صرف کر دی تھیں۔ ملک صاحب کا اشارہ بھلے ہی کسی اور طرف ہو مگر وہ' اپنے منہ پر گرم گرم چھینٹے محسوس کر رہا تھا جن کی شدت سے اُسے اپنا چہرہ جھلستا محسوس ہو رہا تھا۔

ملک مہربان کی آمد سے قبل تقریب کی جگہ بیوگی کا منظر پیش کر رہی تھی۔ تقریب کا آغاز بہت دور لگتا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ملک صاحب اور سرکاری افسر نے گھڑی گھڑی'

گھڑی دیکھ کر بے چینی کا اظہار شروع کر دیا جس کے سبب تقریب کے منتظمین نے کونوں کھدروں میں کھڑے' گپ شپ میں مصروف احباب سے ہال میں تشریف رکھنے کی درخواست کی اور سٹیج سیکریٹری کو مہمان مقررین کی فہرست اور ترتیب سمجھاتے ہوئے تقریب کے آغاز کی ہدایت کی۔

تلاوتِ قرآن پاک سے تقریب کا آغاز کیا گیا۔ قاری صاحب بڑے خوب رو اور مضبوط آواز کے مالک تھے۔ ملک مہربان کے سیاسی جلسوں میں بڑی پاٹ دار آواز میں تلاوت کر کے اُس کا ترجمہ بھی بڑی نفاست سے کیا کرتے تھے۔ جس آیات کی انہوں نے تلاوت کی اُس کا ترجمہ کچھ یوں تھا۔ ''اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقے میں نہ پڑو'' خاتون نعت خواں نے قاری صاحب کی شخصیت کا سحر چند ثانیوں میں توڑ دیا۔ کم عمری کے باوجود' آواز' نین نقش اور لباس میں بڑی نفاست تھی۔ تقریب کے تمام شرکا سانس روکے اور ٹکٹکی باندھے' بڑی توجہ اور انہماک سے نعت خواں کی جانب متوجہ تھے۔

سب سے پہلے سٹیج سیکریٹری نے' تالیوں کی گونج میں ملک مہربان کو سٹیج پر آنے کی دعوت دی۔ ملک مہربان اپنے دو کلاشنکوف بردار محافظوں کے بیچ سے اٹھ کر ایک ہاتھ میں موبائل فون اٹھائے اور دوسرا ہاتھ سامعین کی جانب ہلاتے ہوئے بڑے کرّ وفر سے سٹیج کی جانب چل پڑے۔ دوسرے نمبر پر سٹیج سیکریٹری کی جانب سے سرکاری افسر کو اُن کی طویل قومی' علمی' ادبی خدمات کی تفصیل و تحسین کے ساتھ پکارا گیا۔ جس کے جواب میں شانِ استغنیٰ کے ساتھ' تیز تیز قدم بڑھا کر' سرکاری افسر سٹیج پر چڑھ گئے۔ تیسرے نمبر پر بزرگ شاعر' ادیب' نقاد' دانشور اور ادبی دھڑے کے سربراہ کو بڑی تعظیم اور تکریم کے ساتھ اسٹیج سے پکارا گیا جس کے جواب میں بڑی عاجزی اور انکساری کے ساتھ مذکورہ بزرگ ایک معاون کی مدد سے سٹیج پر چڑھنے میں کامیاب ہوئے۔ اس کے بعد خاتون کی باری تھی۔ جن کی تعریف میں سٹیج سیکریٹری رطب اللسان تھا۔ پہلے خاتون نے مسکرا کر اپنے دائیں بائیں دیکھا پھر شرما کر گردن نیچے جھکاتے ہوئے اپنا دوپٹہ درست کیا' پرس کھول کر' پڑھنے والے مضمون کی موجودگی پر اطمینان کا اظہار کیا اور آہستہ آہستہ سٹیج کی جانب روانہ ہوگئیں۔

گلے کو کھنکار کر صاف کرتے ہوئے تازہ جوش اور ولولے سے سٹیج سیکریٹری نے آج کے دولہا یعنی صاحب کتاب کو پکارا ''اب میں آج کی تقریب کے دولہا یعنی صاحبِ کتاب! عزیز دوست' قابلِ احترام قلمکار' دوستوں کے لئے ڈھال' دشمنوں کے لئے تلوار! جناب دلبر

صحرائی کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دوں گا.......... جناب !دلبر صحرائی سٹیج پر تشریف لایئے ....میری درخواست ہے جناب دلبر صحرائی سٹیج پر تشریف لے آئیں تاکہ جلسہ کی باقاعدہ کاروائی کا آغاز کیا جاسکے۔''

ہر پکار کے بعد سٹیج سیکریٹری' طاقت کا استعمال بڑھا دیتا ہے جس کے باعث اُس کی آواز باتھ روم میں بھی آسانی سے سنائی دے سکتی ہے.....مگر..........وہ کیا کرے؟.......... کہاں جائے؟..........کس کو مدد کے لئے پکارے ....انسانوں کے بیچ' جانے کے لئے..........انسانی چہرہ کہاں سے لائے..........!!!

☆☆☆

پہلی اننگ

ہمارے ایک دوست کسی نفسیاتی الجھن میں گرفتاری کے بعد' ماہر نفسیات سے مشاورت کے لئے گئے تو انہیں اپنی بابت ہر تفصیل وضاحت سے بیان کرنے کے بعد جس سوال کا سب سے پہلے سامنا ہوا وہ کچھ یوں تھا۔ ''دروازے پر آہٹ یا اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے پر آپ چونک تو نہیں جاتے؟'' ہمارے دوست نے ماہرِ نفسیات کے اس بے تکے سوال کی بابت ہماری رائے جاننا چاہی تو ہم نے' نفسیات میں کورا ہونے کے باوجود اس کی توجیہہ میں اعصابی کمزوری کا جواز پیش کر دیا۔ انہوں نے سر ہلاتے ہوئے گویا ہمارے خیال کی تائید کی اور کچھ شواہد ایسے بیان کئے جس سے ان کے اعصاب کی شکستگی کے آثار ظاہر ہوتے تھے۔

اچانک اس واقعے کے یاد آنے کا سبب' ٹیلیفون کی گھنٹی پر ہمارا' بے ساختہ چونکنا بلکہ سہم جانا ہمیں اس وسوسے میں مبتلا کر رہا ہے' ہم بھی اعصابی کمزوری کی کیفیت سے دوچار تو نہیں .... ٹیلیفون کی مسلسل چنگھاڑ نے' ہماری ذہنی وجسمانی صحت کی بابت' خیالات کو اندھے کنوئیں میں دھکیل دیا .... بیگم کی افسردہ آواز میں سنائی گئی خبر نے' سوچوں کو اپنی ذات سے نکال کر ایک اور طرف الجھا دیا .... ہم اپنی بے بسی اور کاتب تقدیر کے بے وقت فیصلوں پر کڑھ رہے ہیں۔ گزرا ہوا وقت بارش کے تیز چھینٹے کی مانند ہمارے دل و دماغ پر برس کر گزر گیا ہے .... یہ وقت خود کو بکھیرنے کے بجائے سمیٹنے کا ہے۔ ہم نے

جلدی جلدی میز پر پڑی فائلوں کو اپنے سامنے سے ہٹایا۔ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے ڈرائیور کو فوراً گاڑی نکالنے کی تاکید کی اور کرسی کی پشت سے کوٹ اتار کر پہننے کے بجائے بائیں ہاتھ پر لٹکا کر تیزی سے سیڑھیاں اترنا شروع کر دیں۔

محبت' الفت' غم' غصہ و جذبات میں انسان دعوے تو بڑے بڑے کرتا ہے۔ عملی طور پر جب کسی مسئلے کا سامنا ہوتا ہے تب اُسے اپنی برداشت و استعداد کا پتہ چلتا ہے۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے اندر ہم دونوں میاں' بیوی زچ ہو چکے تھے اور بازو شل ہونے کا عذر پیش کر رہے تھے۔ میرا چھوٹا بیٹا علی' مسلسل روئے جا رہا تھا۔ خدا معلوم وہ کس تکلیف میں مبتلا تھا۔ کوئی ٹوناٹوٹکا اور تدبیر ایسی نہ تھی جو ہم نے آزمائی نہ ہو' درد کی گولی پیس کر ماں کے دودھ میں حل کر کے بچے کے حلق میں انڈیلی۔ سر میں تیل کی مالش کی۔ کان میں درد کی دوا ڈالی۔ پیٹ کی سکائی کی۔ وقفے وقفے سے گھٹی اور گرائپ واٹر کی ایک چمچی پلائی مگر بچے کا رونا کم نہ ہوا۔ اس پریشانی میں رات کے بارہ بج گئے دونوں میاں' بیوی بھی نڈھال ہونے لگے۔ ہماری چڑچڑاہٹ آپس کی گفتگو میں نمایاں ہونے لگی۔ کال بیل کی آواز نے پریشانی کو جھنجھلاہٹ میں بدل دیا۔ ہم تو پہلے ہی بچے کی تکلیف کے باعث تنگ ہیں۔ نہ جانے اس وقت کون آ گیا ہے مزید تنگ کرنے۔ چونکہ ہم' اس محلے میں نئے آئے ہیں اس لئے زیادہ لوگوں سے واقفیت نہیں۔ البتہ! محلے کی ہر دلعزیز شخصیت بھائی ایوب سے شناسا ضرور ہیں۔

''عقیل صاحب! خیریت تو ہے؟ بچہ مسلسل رو رہا ہے۔ خدانخواستہ طبیعت تو ....؟''

میرا خیال ہے کوئی اندرونی تکلیف ہے شائد؟''

''خیال سے کیا مراد ہے' ڈاکٹر سے چیک نہیں کرایا آپ نے؟''

''ساڑھے نو' دس بجے تک ٹھیک ٹھاک کھیل رہا تھا اُس کے بعد رونا شروع کیا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ بچے کی تکلیف بھی بڑھ رہی ہے۔ آپ ہی بتایئے! اس وقت ڈاکٹر کہاں مل سکتا ہے؟'' میری بات کی صداقت میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔

''کیا میں بچے کو دیکھ سکتا ہوں؟''

''جی' جی ضرور۔'' اندر آ کر بیگم سے پردہ کرنے کو کہا تو اُن کی تیوری پر بل پڑ گئے۔

''میں ماں ہوں' مجھے کچھ پتہ نہیں چل رہا' یہ معصوم منہ پھاڑ کے انہیں بتائے گا' کہاں تکلیف ہے' کتنی تکلیف ہے۔''

میرے گھورنے پر' بچے کو میری گود میں پٹختے ہوئے بیگم دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ میں

نے بھائی ایوب کو اندر بلا کر بچہ ان کی گود میں دیا تو وہ اُس کا اِس طرح معائنہ کرنے لگے جیسے ماہر ڈاکٹر کرتا ہے۔ کبھی نبض دیکھتے، کبھی پیٹ سہلاتے، کبھی مونڈھے دباتے اور کبھی پنجے سہلانے لگتے۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے تھوڑی دیر منہ ہی منہ میں بُڑ بڑ کی اور بچے کو واپس میری گود میں دے کر بولے!

"میں چند منٹ میں حاضر ہوتا ہوں، میرا انتظار کیجئے گا۔"

واپسی پر بھائی ایوب کے ہاتھ میں Cotton Creep Bandage تھی جو اکثر ڈاکٹر صاحبان ہڈی کی معمولی چوٹ میں باندھنے کی تاکید کیا کرتے ہیں۔ بھائی ایوب نے بچے کے مونڈھے اور گردن کے درمیان بڑی نفاست سے پٹی لپیٹ کر بچے کا مونڈھا سہلانا شروع کر دیا اور بچے کا سر کاندھے سے لگا کر ٹہلتے ہوئے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر بچے پر دم کرنے گئے۔ بچے کے رونے میں شدت نہ رہی تھی۔ آہستگی سے میری گود میں بڑھاتے ہوئے بولے!

"اس کی والدہ کو دے آئیں انشاءاللہ دودھ پی کر سو جائے گا۔"

واقعی! کچھ دیر بعد بچہ اپنی والدہ کی گود میں چین کی نیند سو گیا۔ بھائی ایوب کے اجازت مانگنے پر مجھے پشیمانی کا سامنا ہوا کہ میں اخلاقاً بھی ان کی خاطر تواضع کی بابت دریافت نہ کر سکا۔ البتہ ان کے گھر تک چھوڑنے گیا اور راستے میں کئی بار ان کا شکریہ ادا کیا۔

"میاں! آپ ہمارے پڑوسی ہیں اور پڑوسی سے بڑھ کر عزیز، رشتہ دار کوئی نہیں ہوتا۔ خدانخواستہ! بچہ پھر تکلیف محسوس کرے تو فوراً مجھے بلا لیجئے گا۔ ڈاکٹر شاہ صاحب میرے مہربان دوست ہیں۔ میری بے وقت حاضری پر کبھی برا نہیں مناتے۔" قریب میں ڈاکٹر کی موجودگی کا سُن کر پریشانی کسی قدر کم ہوئی۔ گھر پہنچ کر بچے کو سوتا دیکھ کر مزید اطمینان ہوا۔

میری شروع سے عادت ہے، وقت پر نہ سوؤں تو پھر نیند نہیں آتی۔ آج بھی ایسا ہی ہوا۔ باوجود کوشش کے نیند نہ آئی تو کتاب لے کر پڑھنے کے کمرے میں چلا گیا۔ کتاب دلچسپ تھی۔ وقت کا احساس ہی نہ ہوا۔ اذان کی آواز سن کر دل میں، باجماعت نماز کی خواہش پیدا ہوئی۔ آپ کو بتاتا چلوں، میں گنڈے دار نمازی ہوں اور زیادہ تر فجر اور عشاء کی نماز باقاعدگی سے پڑھتا ہوں وہ بھی گھر پر۔ مسجد میں صرف ایک صاحب موجود تھے جو بڑے لحن کے ساتھ کلام پاک کی تلاوت کر رہے تھے۔ میں وضو سے فارغ ہو کر سنت پڑھنے میں مشغول ہو گیا مگر میری توجہ اپنی نماز سے زیادہ کلامِ پاک کی تلاوت پر مبذول تھی کیونکہ قاری کی پرسوز

آواز سیدھی دل پر اثر کر رہی تھی۔ سلام پھیر کر قاری صاحب سے ملنے کی خواہش میں باآواز بلند اسلام علیکم کہہ کر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیئے۔ سبحان اللہ یہ تو اپنے بھائی ایوب نکلے! بالکل ہشاش بشاش' مجھ سے پہلے بول پڑے۔

''سوچ رہا تھا نماز سے فارغ ہو کر آپ کی طرف' بچے کی خیریت معلوم کرنے آؤں گا۔ کیسا ہے وہ؟ انشاء اللہ ٹھیک ہوگا۔''

''جی بالکل! خدا کا شکر ہے آپ کے جانے کے بعد سے گہری نیند سو رہا ہے۔''

''الحمد للہ''

میرا جواب سن کر بھائی ایوب نے خدا کا شکر ادا کیا۔ مسجد سے واپسی پر میں اور بھائی ایوب ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ ان کے انداز سے ذرا بھی شک نہ ہوتا تھا کہ یہ صاحب رات دیر تک جاگتے رہے ہیں۔ میں نے آہستگی سے دریافت کیا۔

''اتنی رات تک جاگنے کے باوجود' آپ اتنی جلد اٹھ گئے؟''

''میاں! میں تو اپنے وقت سے پانچ منٹ لیٹ اٹھا ہوں' تبھی اذان میں کچھ تاخیر ہوئی ہے۔''

''ہیں..................اذان آپ دیتے ہیں؟''

''صرف فجر کی' یہ میرے اللہ کی کرم نوازی ہے کہ اس نے مجھ گنہ گار کو یہ سعادت بخشی ہوئی ہے۔ صبح ہی صبح اپنے رب کو پکارنے سے جو تازگی اور توانائی ملتی ہے وہ دن بھر آپ کو تر و تازہ رکھتی ہے۔''

باتوں کے درمیان' ہم بھائی ایوب کے گھر کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ بھائی ایوب کے اصرار پر جب میں نے ان کے گھر میں قدم رکھا تو مجھ پر میرے تصور کی دنیا آشکار ہوگئی۔ لان میں موتیا' گلاب' چمبیلی' ٹیوب روزز' گلِ داؤدی' یاسمین کی خوش رنگ و خوش نما کیاریاں اور گملے ترتیب' نفاست اور سلیقے کی انتہا کو چھو رہے تھے۔ طرح طرح کی فرحت افزا خوشبو طبیعت کو مسحور کر رہی تھی۔ میرے لب ہلنے سے پہلے بھائی ایوب گویا ہوئے۔

''میاں! ہمیں تو پھول' پودوں سے اپنی اولاد کی طرح عشق ہے اور ان ہی میں ہمارا دل دھڑکتا ہے۔''

میرا دل' دماغ اور میری روح ایک جگہ تھم کر رہ گئی تھی۔ میرے قدم جنبش پر قطعی آمادہ نہ تھے۔ بھائی ایوب ہاتھ پکڑ کر ڈرائنگ روم کی جانب قدم بڑھانے لگے تو میں بے

خیالی میں To Chain کی ہوئی گاڑی کی مانند ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ حیرت کے خوش گوار مناظر وہاں بھی میرے منتظر تھے۔ واہ واہ! سبحان اللہ ہر چیز میں سلیقہ ہر چیز قابل داد' کشن' پردے' قالین' کلر سکیم کا امتزاج لاجواب۔ آخری سرے پر نگاہ پہنچی تو میں مبہوت ہو کر رہ گیا۔ نہایت کشادہ بک شیلف میں ایک سے ایک نفیس' نادر اور ضخیم کتاب قرینے سے سجی ہوئی صاحب ذوق کی اس طرح منتظر جس طرح کوئی اپنے محبوب کے فراق میں ہوا کرتا ہے۔ بھائی ایوب کی شخصیت کا سحر' مجھ پر پوری طرح طاری ہو چکا تھا میں سبک روی سے اس میں بہا جا رہا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر سے چائے کی ٹرالی میری منتظر تھی۔ میرے اوپر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ بھائی ایوب کی اپنے گھر آمد پر میں ان کی تواضع تو کجا صلح بھی نہ مار سکا تھا جبکہ منٹوں' سیکنڈوں میں بلا کسی تاکید و ہدایت کے اُن کے گھر سے میری تواضع کے لئے اس طرح سجی سجائی ٹرالی آ گئی تھی جیسے آسمان سے من و سلویٰ اُتر آیا ہو۔ ہر ہر چیز بڑی محبت' بڑی لجاجت سے بھائی ایوب نے میری پلیٹ میں رکھی اور اصرار کر کے کھلائی واپسی پر مجھے میرے گھر تک چھوڑنے آئے۔

''عقیل صاحب! زحمت نہ ہو تو بچے کی خیریت معلوم کر کے بتایئے۔''

میں اندر جا کر بچے کو لے آیا اور بھائی ایوب کی گود میں ڈال دیا۔ بچہ زور زور سے قلقاریاں بھرنے اور گلے سے عجیب و غریب آوازیں نکال کر بھائی ایوب سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ شائد! رات کے واقعے پر بھائی ایوب کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ بچے کو پیار کرتے ہوئے' بھائی ایوب نے دھیرے سے اُس کا مونڈھا دبا کر تسلی کی اور میری آنکھوں میں سوال پڑھ کر گویا ہوئے۔

''عموماً لاڈ پیار میں بچے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر لٹکا لیا جاتا ہے جس سے کبھی کبھی بچے کی ہنسلی اتر جاتی ہے۔ گھر میں بڑے بوڑھے موجود ہوں تو انہیں ضرور اندازہ ہو جاتا ہے مگر نوجوان نسل اس امر سے قطعی بیگانہ ہے۔''

دوسری صبح' گیا تو مسجد نماز پڑھنے ہی تھا مگر میرے دل میں بھائی ایوب سے ملاقات کی خواہش زیادہ شدید تھی۔ معمول کے مطابق بھائی ایوب تلاوت میں مصروف تھے۔ میرے سلام کے جواب میں وعلیکم اسلام کہا اور بچے کی خیریت دریافت کرنے کے بعد پھر سے تلاوت میں مصروف ہو گئے۔ نماز کے بعد میری خواہش تھی کہ بھائی ایوب کو اپنے گھر لے جا کر تواضع کروں۔ تھوڑا بہت اپنی نظروں میں سُرخرو ہو سکوں۔ میرے اصررار پر بھائی

ایوب نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

''عقیل میاں! کل آپ کے احترام میں نہ جا سکا تھا۔ آج مجبوری ہے! صبح کی نماز کے بعد میں سیر کو جاتا ہوں۔ بہ منظورِ خدا شام کو ملاقات ہوگی۔''

میرا تجسس واشتیاق دوآتشہ ہو رہا تھا اور میں سوچوں میں غرقاب تھا۔ صبح کی سیر' باغبانی کا شغف' مطالعے کا شوق' اللہ سے لو لگانے کی تڑپ اور خدمتِ خلق' بڑے آدمیوں کی تمام تر خوبیاں اور نشانیاں بھائی ایوب میں یکجا ہوگئی ہیں وگرنہ آج کل کے نودولتیے مشاغل یا فیشن کے طور پر ان میں سے کوئی وصف اپنا کر نمایاں ہونے کی بھونڈی کوشش کرتے ہیں۔

ہمارے دوست شیخ نور محمد نے چینی کے کاروبار سے بے پناہ دولت کما کر عالیشان کوٹھی بنوائی اور پڑھنے کے کمرے میں ایک بڑا سا بک شیلف بھی بنوایا جس میں ایک سے ایک مہنگی اور مجلد کتاب سجائی گئی۔ ان کے ذخیرۂ کتب میں ''کلیاتِ فیض'' دیکھ کر ہم نے دریافت کیا ''شیخ صاحب ''نسخہ ہائے وفا'' کی بابت آپ کی کیا رائے ہے۔''

''ضرورت ہی نہیں پڑی کبھی۔''

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟''

''بھئی گھر میں کوئی بیمار ہی نہیں ہوا۔''

ہمارے سالے صاحب نے کسٹم کی نوکری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دنیا جہان سے بے شمار اقسام کے پودے اور سجاوٹ کا سامان احباب ورشتہ داروں کو مرعوب کرنے کے لئے اکٹھا کیا ہوا ہے اور دوبئی سے آنے کے بعد ہمارے بہنوئی صاحب باقاعدگی سے اپنی لیفٹ ہینڈ ڈرائیو مرسڈیز پر صبح کی سیر کو جاتے ہیں اور گردن گھما کر دائیں بائیں چلنے والوں کی بے بسی پر رحم کھاتے ہیں۔

بھائی ایوب میں نمود ونمائش یا تصنع نام کی کوئی شے نہ تھی۔ ان کے خلوص' مروت اور جانثاری نے ہمارے درمیان فاصلے ختم کر دیئے تھے۔ میرے اندر ہر وقت یہ خواہش سر ابھارتی کہ میں بھائی ایوب کے بارے میں وہ سب کچھ جان لوں جو اور لوگ نہیں جانتے۔ اس کے لئے مجھے خاصا وقت بھائی ایوب کے ساتھ گزارنا پڑا جس کے بعد بھائی ایوب کی بابت مکمل طور پر باخبر ہو سکا۔

پیشے کے اعتبار سے بھائی ایوب سول انجینئر تھے۔ والدین وفات پا چکے تھے۔ کل چار بچے جن میں بڑی بیٹی شادی شدہ اور ماسٹر ڈگری ہولڈر' دوسرے نمبر کا بیٹا میڈیکل کے

تھرڈ ایئر اور تیسرے نمبر کا بیٹا سیکنڈ ایر کا طالب علم ہے۔ سب سے چھوٹی بیٹی میٹرک میں پڑھتی ہے۔ بھائی ایوب کے روزمرہ معمولات کچھ اس طرح ہیں۔ صبح تہجد کے وقت اٹھتے اور گھر پر تہجد پڑھنے کے بعد مسجد جا کر فجر کی اذان دیتے ہیں۔ اذان کے بعد تلاوت اور نماز اس کے بعد صبح کی سیر کو جاتے ہیں۔ واپسی پر پودوں کی دیکھ بھال، تراش خراش اور اُن کی ضرورت کے مطابق ناپ تول کر پانی دیتے ہیں۔ ناشتے سے فارغ ہو کر دفتر کی تیاری پکڑتے ہیں۔ دوپہر کا کھانا چھوڑے ایک زمانہ گزر چکا۔ عصر کے وقت دفتر سے واپسی ہوتی ہے۔ ایک کپ چائے کے بعد نماز کو چلے جاتے ہیں۔ نماز کے بعد کا وقت علاقے کے رفاہی کاموں کے لئے وقف ہے۔ محلے کی ڈسپنسری، سکول اور مسجد کے نگران بھائی ایوب ہی ہیں۔ مغرب کی نماز کے فوراً بعد کھانا کھا کر محلے کے نادار بچوں کو پڑھاتے ہیں۔ ایک دن میں نے دبے لفظوں میں پوچھ ہی ڈالا۔

''آپ تو ماشاءاللہ بہت اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ جس کا مشاہرہ بھی مناسب ہے پھر آپ کو ٹیوشن پڑھانے کی کیا ضرورت ہے؟''

''ارے نہیں نہیں! میں اس لائق کہاں، بھئی اپنے بچوں کو کچھ نہ کچھ وقت دینا ہی پڑتا ہے جن کے ساتھ محلے کے چند ذہین بچے بھی آ جاتے ہیں۔ کچھ میں انہیں بتا دیتا ہوں کچھ ان سے سیکھ لیتا ہوں۔''

''اِس کے بعد کیا کرتے ہیں؟'' سوال کم طنز زیادہ تھا۔

''کرنا کیا ہے میاں! بس عشاء کا وقت ہو جاتا ہے۔ عشا پڑھ کر کچھ وقت گھریلو معاملات پر خاتونِ خانہ سے گفتگو، بچوں سے گپ شپ اور حالات حاضرہ پر تبادلہ خیال کرتا ہوں۔ موقع ہو تو خبریں سن لیتا ہوں اور ٹھیک دس بجے اپنے کمرے میں چلا جاتا ہوں۔ تھکن زیادہ ہو تو موسیقی سنتا ہوں اس کے بعد احباب کے خطوط کے جواب اور کچھ دیر مطالعے کے بعد نیند کی آغوش میں چلا جاتا ہوں۔''

''آپ کے شیڈول میں آرام کا وقت ہے نہ سیر و تفریح اور انجوائے منٹ کا؟''

''عقیل صاحب! آرام کی بابت تو میں یہ کہوں گا کہ ایک صحت مند انسان کو چار سے پانچ گھنٹے کی نیند ہشاش بشاش رکھنے کیلئے کافی ہے۔ جہاں تک سوال سیر و تفریح کا ہے۔ یہ بھی آپ نے خوب کہی۔ میاں! ہم اور آپ، اس دنیا میں سیر و تفریح کے لئے ہرگز نہیں بھیجے گئے۔''

''پھر کس لئے بھیجے گئے ہیں؟''

''کچھ کرنے کے لئے' کچھ کمانے کے لئے''

''کس کمائی کی بات کر رہے ہیں آپ! میں قطعاً نہیں سمجھا؟''

''کسی کھیل سے دلچسپی ہے آپ کو؟''

''جی! کرکٹ سے ہے۔''

''جس طرح کرکٹ کے کھیل میں کھلاڑی کو دو اننگ میں مختلف صورتوں میں کھیل کا مظاہرہ کرنا ہوتا ہے یعنی بالنگ اور بیٹنگ۔ اسی طرح یہ زندگی بھی دو اننگ پر مشتمل ہے۔ پہلی کمانے اور دوسری کھانے کی۔ کبھی آپ نے یہ نہیں دیکھا ہوگا کہ کوئی کھلاڑی' دوسری اننگ کو جواز بنا کر پہلی اننگ میں سستی یا کاہلی کا مرتکب ہوا ہو۔ بس میاں! ہماری خواہش اگر دوسری اننگ میں رنگ بھرنے کی ہے تو ہمیں پہلی اننگ سے صحیح صحیح انصاف کرنا چاہئے۔''

ہماری عمروں میں بہت زیادہ فرق نہ تھا۔ میں چالیس کے پیٹے میں اور بھائی ایوب پچاس کے لگ بھگ مگر علم' عمل اور برداشت میں' میں ان سے صدیوں پیچھے تھا۔ جس کے باعث میرے دل میں بھائی ایوب کا احترام خود بخود جاگزیں ہوتا گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ بھائی ایوب نے میرے رہنما' دوست اور مرّبی کی حیثیت اختیار کرلی۔ میرے تمام مسائل کا حل ان کی چٹکی میں حل ہو جاتا۔ میں نے کچھ توجہ اور دھیان سے بھائی ایوب کی باتوں پر غور کیا تو ان کی منزل کا نشان نمایاں طور پر مجھے نظر آنے لگا۔ دل میں میرے بھی خواہش ہوئی مگر اُن جیسی بردباری' ٹھہراؤ اور کشادگی میں کہاں سے لاتا؟ وہ ایک سمندر تھے ٹھہرا ہوا' خاموش اور پرامن سمندر' جو چاہے جب چاہے اپنے حصے کی مسیحائی اس سمندر سے نکال لے۔ مجال ہے! سمندر میں کوئی شور' تلاطم یا مدوجزر کے خفیف سے آثار بھی نمایاں ہوں۔

جس دن فجر کی نماز میں بھائی ایوب حاضر نہ تھے میں ان کی خیریت دریافت کرنے ان کے گھر گیا تو انہیں بستر پر دیکھ کر حیرت واستعجاب میں مبتلا ہوگیا۔

''یہ غلط ہے جناب! آپ نے پہلی اننگ میں دوسری اننگ کا کھیل کس کی اجازت سے شروع کردیا؟''

''بھئی! اس میں کھلاڑی کی منشا کو' کب دخل ہوتا ہے۔ امپائر کی مرضی ہے۔ کھلاڑی کی زندگی تو اس کے اشارے کی مرہون منت ہوا کرتی ہے۔''

''ڈاکٹر نے مکمل آرام کا مشورہ دیا ہے۔ پتہ نہیں کب سے طبیعت خراب ہے۔ یہ

لیٹنے والے کہاں تھے؟ بڑی مشکل سے مانے ہیں۔'' بھابھی کے لہجے میں غصہ کم اور بے بسی نمایاں تھی۔

میرے اصرار پر بھائی ایوب نے صرف اتنا بتایا کہ جگر پر ورم اور معدے پر زخم ہے۔ یہ اتنی مہلک بیماریاں تو نہیں کہ آدمی بستر سے لگ جائے' بھائی ایوب نہ صرف بستر سے لگ گئے روز بروز لاغر ہوتے گئے۔ میں نے بڑی کوشش کی' اُن کے ڈاکٹر سے ملوں' بیماری کے بارے میں پتہ لگاؤں میرے بس میں جو بھی ہے کر گزروں مگر بے سود! ہر بار بھائی ایوب یہ کہہ کر ٹال دیتے۔

''میاں! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اللہ بہتر کرے گا۔''

میرے عزیزو! ماہرِ نفسیات نے ہمارے دوست کے اعصاب کی شکستگی کا اندازہ شائد درست طور پر ہی لگایا ہو مگر ہر بار دروازے کی آہٹ اور گھنٹی کی آواز پر آدمی' اعصاب کی کمزوری کے باعث نہیں چونکتا۔ کبھی کبھی اس کے لاشعور میں چھپا خوف اسے چونکنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ بالکل میری طرح' میں اعصابی کمزوری نہیں' بھائی ایوب کی بیماری کے خوف سے ٹیلیفون کی گھنٹی پر چونکا تھا۔

اگلے قدم پر' چونکنے کے ساتھ میں سہم بھی گیا ہوں .... بھائی ایوب کے چہرہ پر معصومیت' نُور اور تر و تازگی تو ان کی پاکیزگی کی آئینہ دار ہے.......... مگر..........ان کی کھلی ہوئی آنکھوں میں..........نظر آنے والا احتجاج..........کس چیز کی دلیل ہے......؟

☆☆☆

نقش برآب

''ارے تم .... ؟ اتنی مدت بعد ....! آؤ آؤ اندر آ جاؤ .... خیریت تو ہے' پریشان دکھائی دیتے ہو۔''

''تمہارا اندازہ درست ہے دوست' واقعی اس وقت میں سخت پریشانی میں مبتلا ہوں۔ بڑی آس لے کر آیا ہوں تمہارے پاس' مجھے مایوس مت لوٹانا۔''

''نہیں نہیں' تم دل چھوٹا نہ کرو' بیٹھو تو سہی' میں جس لائق بھی ہوں حاضر ہوں۔''

نو وارد بیٹھنے کا اشارہ پاتے ہی قریب پڑے قیمتی صوفے کو گھسیٹ کر اُس میں دھنس گیا۔

''پانی مل جائے گا' پیاس کے مارے حلق میں کانٹے چبھ رہے ہیں۔''

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔'' صاحب خانہ نے جمبو سائز کے امپورٹیڈ فریج سے منرل واٹر کی یخ بستہ بوتل نکال کر ڈھکن کھولا اور مہمان کی طرف بڑھا دی۔ پریشان حال اور نڈھال مہمان نے ندیدوں کی طرح لپک کر میزبان سے بوتل جھپٹی اور اُسے دونوں ہاتھوں میں دبوچ کر ایک ہی سانس میں غٹا غٹ پی گیا۔ میزبان نے مہمان کی پیاس کی شدت کا اندازہ کرتے ہوئے فریج سے دوسری بوتل نکال کر کھولی اور مہمان کی طرف بڑھا دی جو اُس نے پہلی بوتل کی نسبت اطمینان سے پینے کے بعد قمیض کے بٹن کھولے اور سائیڈ پاکٹ سے رومال نکال کر گردن اور ماتھے سے پسینہ پونچھنے لگا۔

''اب بتاؤ! ایسا کون سا مسئلہ آن پڑا جس نے تمہیں اس درجہ پریشان کر دیا ہے.......... بلکہ ٹھہرو' ایسا کرتے ہیں! دونوں اکٹھے کھانا کھاتے ہیں۔ میں نے بھی عرصے سے کسی ہمدرد' غمگسار کے ساتھ کھانا نہیں کھایا۔ تمہیں دیکھ کر میری بھوک چمک اٹھی ہے۔''

''جیسے تمہاری مرضی .... بھوک تو نہیں ہے تمہاری خواہش کے پیشِ نظر چند لقمے لے لوں گا۔''

نزدیک کھڑا ملازم حکم کا منتظر تھا۔ مالک کا اشارہ پا کر کچن کی جانب لپکا۔ وہ دونوں واش بیسن سے باری باری ہاتھ دھو کر کھانے کی میز پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ ملازم اس دوران انواع واقسام کے کھانے اور موسم کے بہترین پھل میز پر چننے میں مصروف ہو گیا۔

''اس قدر رنجلت میں کھانے کا اہتمام دیکھ کر تم حیران ہو رہے ہو گے دوست! میرے آسیب زدہ گھر میں جسے مکان کہنا زیادہ مناسب ہے یہ اہتمام ہر روز باقاعدگی سے ہوتا ہے۔ ہر روز مجھے کسی مہمان کا انتظار رہتا ہے۔ مقدر سے کوئی آ جائے تو خوش قسمتی وگرنہ ملازم کے بچوں کا بھلا ہو جاتا ہے۔ اس سے پوچھو! آج کتنی مدت بعد شوق سے کھانا کھا رہا ہوں۔ ارے تم کھاؤ گے بھی یا میری باتیں ہی سنتے رہو گے۔ یہ لو! مرغ بہت لذیذ اور خستہ روسٹ کرتا ہے بھنا ہوا گوشت پکانا تو اس پر ختم ہے۔ پیشے کے اعتبار سے ہے تو یہ خانساماں' میرے گھر میں اس کی اور بھی کئی ذمہ داریاں ہیں۔ مثلاً بیرا' خانساماں' اردلی اور میرے پرائیویٹ سیکریٹری کے فرائض بھی یہی سرانجام دیتا ہے..... میرا خیال ہے گفتگو کا سلسلہ جاری رہا تو تم کچھ نہ کھا سکو گے.......... سویٹ ڈش ضرور لو اور بتاؤ یہ ذائقہ اس سے پہلے تم نے کب اور کہاں چکھا تھا؟

''واہ واہ! بہت خوب' سبحان اللہ.......... بھئی یہ تو ہو بہو شاجو بھابی کے ہاتھ کا بنا معلوم ہوتا ہے۔ یقین کرو! مجھے آج بھی شاجو بھابی کی وہ دعوت یاد ہے جب ان کے والدین شادی کے سلسلے میں دیو بند گئے ہوئے تھے اُن کے دونوں بھائی منصور وتنصیر کام پر چلے گئے تھے تو انہوں نے تمہارے تینوں دوستوں یعنی اصغر' احمد اور میری دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ تمہاری خاص فرمائش پر میٹھے میں اس طرح کے شاہی ٹکڑے بنائے تھے۔ اس سالے احمد سلام عرف گلن کو تو شاجو بھابھی کے ہاتھ کے شاہی ٹکڑے بھولتے ہی نہ تھے۔ جب بھی آتا پھسکڑا مار کر بیٹھ جاتا۔ بچوں کی طرح ضد کر کے شاہی ٹکڑے بنوا کر کھاتا تب کہیں ٹلتا۔

''چھوڑو یار! پرانی باتوں کو' تمہارے لئے ان میں کوئی دلچسپی ہو گی۔ میرے لئے تو بھولے بسرے خواب سے زیادہ ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ تم یہ بتاؤ کھانے کے بعد کیا پینا پسند کرو گے؟

''میرا خیال تھا تم بوڑھا ہونے کی ایکٹنگ کر رہے ہو۔ لگتا ہے تم بھی میری طرح سچ مچ بوڑھے ہو گئے ہو وگرنہ مجھ سے چائے یا کوفی کی بابت ہرگز دریافت نہ کرتے۔''

''ارے ہاں .... یاد آیا' بچپن میں یرقان ہونے کے باعث تم نے تو کوفی کو کبھی ہاتھ ہی نہیں لگایا۔ اس کا مطلب ہے دونوں بھائی چائے پئیں گے۔''

''شکر ہے تمہیں پرانی باتیں ابھی بھی یاد ہیں۔''

''ابھی بھی سے کیا مطلب ہے یار ....! خیر چھوڑو تم اپنی پریشانی کی بابت بتاؤ! یقین کرو جب تم آئے تو اتنے ہونق لگ رہے تھے کہ تمہیں دیکھ کر میں تم سے زیادہ پریشان ہو گیا تھا .... کیا خیال ہے! چائے اُدھر صوفے پر بیٹھ کر نہ پی جائے .... ویسے ایک دوستانہ مشورہ ہے میرا .... انسان کو چھوٹی چھوٹی باتوں پر پریشانی کا اظہار نہیں کرنا چاہئے اس طرح ....''

''تمہارا خیال ہے میں کوئی بچہ ہوں اور انگلی سے خون بہہ نکلنے پر چیختا چلاتا تمہارے پاس مدد کے لئے چلا آیا ہوں۔'' مہمان کے لہجے میں برہمی نمایاں تھی۔

''ارے نہیں نہیں .... خدانخواستہ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا...... میں تو یہ کہنا چاہتا تھا' آدمی کو جب بھی کسی پریشانی کا سامنا ہوتا ہے وہ اُسے ہی زندگی کی سب سے بڑی پریشانی سمجھ کر بلبلا اٹھتا ہے حالانکہ مستقبل قریب و بعید میں پیش آنے والی پریشانیوں کے مقابلے درپیش پریشانی کوئی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ بعض اوقات تو اپنی حماقت پر ہنسنے کو جی چاہتا ہے .... شکر کتنی لو گے؟''

''جتنی تم چاہو ....''

''آہا .... کس زمانے کی بات کرتے ہو......... ہم تو کب کے شوگر کے مرض کے باعث اس نعمت سے محروم ہو چکے۔''

''ایسا ہے تو پھر ایک چمچ مناسب ہے۔''

''ہاں تو کیا کہہ رہا تھا میں ....؟ پریشانی کون سی بڑی' اہم ہوتی ہے۔ اس کا صحیح اندازہ انسان کو اس وقت ہوتا ہے جب زندگی کی شام قریب ہوتی ہے۔ آنکھوں کے سامنے جھٹپٹا منڈلا رہا ہوتا ہے اور جسم سے توانائی کے ایک ایک قطرہ کا حصول دشوار تر ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال اونٹ کی مانند ہے جب تک وہ پہاڑ کے نیچے سے نہیں گزرتا خود کو دنیا کی سب سے اونچی

اور بلند شے سمجھتا ہے۔ ذہن کے اوپر سے وقت کی دھول صاف کرو' تمہیں قیام پاکستان کا زمانہ فوراً یاد آ جائے گا۔ ہم لوگ بچوں میں شمار ہوتے تھے نہ بڑوں میں اس کے باوجود اپنے بزرگوں' رشتہ داروں کی پریشانیاں دیکھ کر ہمارے دل کس قدر ہولا کرتے تھے۔ گھر والوں کے ساتھ ہم لوگ بھی کس طرح گڑگڑا کر دعائیں کیا کرتے تھے۔ کسی طرح صحیح سلامت آزاد اور پاک وطن میں پہنچ جائیں۔ اُس وقت ہمارے نزدیک زندگی کی سب سے بڑی یہی پریشانی تھی۔

''ہائے ہائے کیا دن یاد کرا دیئے کاش! حقیقی زندگی میں بھی ریوائنڈ کی سہولت دستیاب ہوتی۔ ایک پل کی تاخیر کئے بغیر' میں اُسی دور میں جانا پسند کرتا۔ کم از کم وہ وقت غربت وافلاس اور بے سروسامانی کے باوجود منافقت' ریا کاری اور تصنع سے تو پاک تھا''

''مہاجر کیمپ کا زمانہ یاد کرو! کیسے کیسے دل ہلا دینے والے واقعات آنکھوں کے سامنے رونما ہو رہے تھے۔ جوان بیٹوں کی لاشوں پر بین کرنے کے بجائے بڑے بوڑھے' نومولود وطن پر سب کچھ نچھاور کرنے کے لئے کتنے بے چین تھے۔ کچھ بدبخت آزمائش کے کڑے وقت میں بھی چوری چکاری سے باز نہ آتے تھے۔ بعض تو ایک دوسرے پر شک کر کے باہم گتھم گتھا ہو جایا کرتے تھے۔ کیمپ کی نگرانی پر مامور بہت سے لوگ مہاجروں کو ملنے والے راشن میں ہیرا پھیری کرنے سے بھی نہ چوکتے تھے۔''

''چھوڑ و یار! کیمپ کے دن نہ یاد دلاؤ' واقعی اُس وقت کے حالات میں وہ زندگی کے سب سے سخت دن تھے۔ جن کو یاد کر کے میں آج بھی کانپ اٹھتا ہوں۔''

''یہی تو میں کہنا چاہتا ہوں! تمہیں یاد ہے! پڑھائی میں کتنا کوڑھ مغز تھا میں۔ شائد ہی کوئی دن جاتا جب میں کلاس میں مرغا نہ بنتا ہوں۔ میٹرک کے امتحان کا زمانہ یاد کرو اور میرا اُس وقت کا چہرہ ذہن میں لاؤ۔ ایک طرف کنواں تھا دوسری طرف کھائی۔ والد نے واضح طور پر فیل ہونے کی صورت میں مجھ پر گھر کے دروازے بند کرنے کی دھمکی دے رکھی تھی جبکہ میں رٹا لگانے والے مضامین کے علاوہ انگلش گرائمر' حساب اور الجبرا میں سرے سے کورا تھا...... رزلٹ آیا تو میرے ساتھ تم لوگ بھی حیرت کے غوطے کھا رہے تھے میں نہ صرف پاس ہو گیا تھا بلکہ سیکنڈ ڈویژن بھی لے ماری تھی۔''

''چھوڑو بھی یار! مجھے تمہارا نہ صرف میٹرک بلکہ ایف۔اے میں بھی چڑھاوا دے کر پاس ہونا اچھی طرح یاد ہے۔''

''یہ تمہاری غلط فہمی ہے! جس طرح کی چاہے قسم لے لو میں نے ایک پیسہ بھی ....''

''یار! تمہاری بات کون کم بخت کر رہا ہے۔ میرا روئے سخن تمہارے والد صاحب کی طرف ہے۔''

''تم لوگ فیض عام انٹر کالج کے بعد گورنمنٹ ڈگری کالج میں اعلیٰ تعلیم کے لئے جا چکے تھے۔ مجھے والد صاحب نے اپنے ساتھ کاروبار میں شامل کر کے میری زندگی کی سب سے بڑی پریشانی یعنی پڑھائی سے نجات دلا دی تھی۔''

''وہ بھول گئے خودکشی کی کوشش ....؟''

''واقعی یار! شاہجہاں کے عشق نے مجھے اندھا کر دیا تھا۔ اُس وقت میری زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ اور پریشانی شاہجہاں کا حصول تھا۔ ہسپتال سے لوٹتے ہی والد صاحب نے میرے لئے شاہجہاں کا رشتہ مانگ لیا اُس کے گھر والوں نے بدنامی کے ڈر سے فوری طور پر شادی کی تاریخ پکی کر دی تھی .... پتہ ہے! پہلے بچے کی پیدائش پر قدرت نے مجھے ایک اور امتحان سے دوچار کیا تھا۔''

''نہیں .... میرا خیال ہے اُس وقت ملازمت کے سلسلے میں' میں باہر جا چکا تھا۔''

''کیا پوچھتے ہو یار! محلے کی دائی نے کیس خاصا خراب کر دیا تھا۔ زچہ' بچہ دونوں کی جان خطرے میں پڑ گئی تھی۔ میں اُس مسئلے کو زندگی کی سب سے بڑی پریشانی جان کر ہمت ہار بیٹھا تھا۔ گھر والوں کی دعاؤں اور ڈاکٹر کی کوشش سے خدا نے شاہجہاں اور بچے کو نئی زندگی بخشی تو میری جان میں جان آئی۔ اُس کے کچھ عرصے بعد ملک میں پہلا مارشل لاء لگا اور کھانے پینے کی اشیاء کا کاروبار کرنے والوں پر چھاپے پڑنے لگے جس کی زد میں میرا کاروبار بھی آ گیا۔ فیکٹری' گودام سب ضبط کر لیا گیا اور مجھے تین سال کی قید ہو گئی۔ اُس وقت مجھے شدت سے احساس ہوا کہ دنیا کی سب سے بڑی پریشانی' انسان کی ذلت و رسوائی ہے۔ میں نے خلوصِ دل سے باقی ماندہ زندگی ایمان داری سے گزارنے کا عہد کیا .... رہائی کے بعد اکلوتا مکان فروخت کر کے اس شہر میں آ کر قسمت آزمائی تو خدا نے تمام نقصانات دُور کرنے کے علاوہ پہلے سے بھی دس گنا دے دیا .... عین انہی دنوں جب میرا ستارہ عروج پر تھا مٹی کو ہاتھ لگاتا تو سونا بن جاتی۔ میری کار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔''

''ہاں ہاں! اس کی اطلاع نعیم کے خط کے ذریعے مجھے ملی تھی۔ میں نے تمہارے پُرانے پتے پر افسوس کا خط بھی ڈالا تھا .... تفصیل سے بتاؤ' ہوا کیا تھا؟''

''لمبی کہانی ہے۔ تین سال اپاہجوں کی زندگی گزارنے کے بعد چلنے پھرنے کے قابل ہو سکا تھا۔ اُن تین سالوں میں میری سوچ کا مسلسل یہی محور رہا کہ میں زندگی کی سب سے بڑی پریشانی سے گزر رہا ہوں۔''

''پھر کیا ہوا؟ اس کے بعد تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک رہا نا؟''

''شاید تمہارے پاس اتنا وقت نہ ہو............؟''

''اس عمر میں وقت کے سوا بچا ہی کیا ہے............؟''

''بس یار! وہ تو تم بھی جانتے ہو 1965ء کی جنگ' سامراج نے کس بھونڈے طریقے سے ہم پر تھوپی تھی۔ پوری قوم صحیح طریقے سے اپنے پیروں پر کھڑی بھی نہ ہوئی تھی کس بحرانی کیفیت سے گزری۔ قیام پاکستان کے زمانے کے ڈراؤنے خواب پھر سے ستانے لگے۔ ملک کی سلامتی کو خطرے میں دیکھ کر اپنا وجود بھی ڈولنے لگا دل سے پھر وہی آوازیں آنے لگیں۔ زندگی کی سب سے بڑی پریشانی اپنے وجود کے ساتھ وطن کی سلامتی کا خطرے میں ہونا ہے۔''

''یہ تو ایک طرح سے سب کا مسئلہ تھا یعنی قومی پریشانی تھی۔''

''تم قومی پریشانی کو ذاتی پریشانی شمار نہیں کرتے؟ تمہاری نظر سے علامہ اقبال کا وہ شعر نہیں گزرا۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ بھی نہیں

''میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تم ذاتی پریشانیوں کا ذکر کر رہے تھے۔''

''بس میاں! اسی اثنا میں بچے ہمارے شانوں سے بلند ہونے لگے اور ان کے ساتھ ان کے مسائل بھی سر اُبھارنے لگے۔ تینوں لڑکے باپ کی کمائی ہوئی دولت کے سر پر' جوانی میں مست تھے۔ مسئلہ' اکلوتی بیٹی تھی اول تو کوئی رشتہ نہ آتا' آتا تو ہمارے معیار کے مطابق نہ ہوتا۔ وجہ! بیٹی کی واجبی شکل وصورت اور دبتا ہوا سراپا تھا۔ میں تم سے صاف صاف بتاؤں! اس پریشانی نے مجھے سب سے زیادہ جھنجھوڑ ڈالا اور میں زندگی کی سب سے بڑی پریشانی اسی کو گردان بیٹھا۔ دنیا کی ہر شے کو پیسوں کے عوض خریدنے والا شخص بھی بیٹی کا رشتہ مانگنے خود چل کر کسی کے گھر نہیں جا سکتا۔ میری بدقسمتی کہو یا خوش قسمتی سے تشبیہہ دو ایک طرف میرے خوابوں کی جنت میرا وطن عالمی سازش کے تحت دولخت ہو رہا تھا۔ دوسری طرف میری اسی بربادی سے میرے زخم کا مرہم دریافت ہو رہا تھا۔ بڑی ہمشیرہ چٹاگانگ سے لُٹ پٹ کر آئیں تو ہمارے احسانوں کے عوض رحم کھاتے ہوئے بہن بہنوئی نے کاروبار میں معقول حصہ لے کر اپنے بیٹے

کے لئے میری بیٹی کا رشتہ منظور کر لیا۔''

''چلو گھر کی دولت گھر میں ہی رہی نا.........؟''

''یار! دولت کی کس احمق کو پرواہ ہے۔ دکھ تو اس بات پر ہے کہ اس سب کے باوجود بھی بہن' بہنوئی اور اُن کے بیٹے کا رویہ میری بیٹی کے ساتھ درست نہ تھا۔ ہر وقت ہاتھ دھو کر اُس کے پیچھے پڑے رہتے۔ اچھے بھلے کاموں میں مین میخ نکال کر مُنہ سجائے رکھتے۔''

''بڑی دیر سے تم نے اپنی گفتگو میں بیٹوں کا ذکر نہیں کیا؟''

''بیٹوں سے پہلے ایک بات کا ذکر ضرور کرنا چاہوں گا۔ ضرورت سے زیادہ پیسہ انسان کی آنے والی نسلوں کے لئے فائدہ سے زیادہ نقصان کا باعث ہوا کرتا ہے۔ جسے خرچ کرتے ہوئے اُن کے دل میں درد نام کی کوئی شے نہیں ہوتی کیونکہ اُسے کمانے میں اُن کا خون پسینہ شامل نہیں ہوتا......... تینوں بیٹوں نے ایک سے ایک ماڈرن اور دولت مند خاندانوں کی لڑکیاں پسند کر کے لوہے کو لوہے سے کاٹا یعنی دولت کے مقابلے میں دولت کی بھرپور نمائش کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ بہوؤں کے آنے کے بعد گھر کا ماحول بہتر ہونے کے بجائے بدمزہ ہو گیا۔ ہر کوئی ایک دوسرے سے شاکی' ہر کسی کو دوسرے سے گلہ' کسی کو الگ گھر کی تمنا' کسی کو خودمختاری کی خواہش ......شاہجہاں اس ناچاقی کا زیادہ دن مقابلہ نہ کر سکی۔ ڈھیر ساری بیماریوں کی پوٹ بن کر ہسپتال کی مستقل مہمان بن گئی۔''

''چچ چچ.......... یہ تو بڑے دکھ کی بات ہے۔''

''اتنا وقت گزرنے کے بعد اگر تمہیں رنج ہو رہا ہے تو تم اندازہ کر سکتے ہو کہ اُس وقت میرے دل پر کیا گزری ہوگی اور میں یہ سوچنے میں حق بجانب ہوں گا کہ میری زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہ ہی ہے...........!''

''بیشک......... بیشک!''

''تین تین بیٹے اور بہوؤں کے ہوتے ہوئے' شاہجہاں کی تیمارداری کے لئے' مجھے نرس رکھنا پڑی۔ اُن لوگوں میں اس بات پر بھی لڑائی ہوتی' کس نے ماں کی خدمت کم کی ہے اور کس نے زیادہ......؟ اتنے بڑے خاندان اور ہر وقت کی ناچاقی کے باعث اولاد کی طرف سے میرا دل کھٹا ہو چکا تھا۔ اُن کی خواہش کے پیشِ نظر تینوں بیٹوں کو الگ مکان خرید کر دیئے اور ان کی پسند کے کاروبار کے لئے مطلوبہ رقمیں دے کر اُن سب کو خودمختار کر دیا...... بظاہر مسئلے کا یہ بہترین حل تھا۔ روز روز کی بک بک جھک جھک سے جان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوٹ گئی تھی مگر

یہ ایک باپ کے محسوسات تھے۔ اولاد کی جدائی نے ماں کے اندر گھن لگا دیا تھا جس نے اندر ہی اندر بیماریوں کو پچھاڑ کر شاہجاں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے واپس نہ آنے والے سفر پر رخصت کر دیا.................!''

''ہائے ہائے .... کتنے دکھ جھیلے ہیں تم نے زندگی میں .... بہر حال اب تم یہ سوچنے میں حق بجانب ہو کہ زندگی کا سب سے بڑا دکھ' جیون ساتھی سے جدائی اور تنہا زندگی کا سفر ہے.............''

''ہا.......... ہا.......... یہ نہ تھی ہماری قسمت .... میرے اپنے بے شک! میری موت کے مجھ سے زیادہ خواہش مند ہیں .... یہ جانتے ہوئے بھی' مستقبل سے مجھے خیر کی اُمید تھی .... مگر .... مغرب سے اُبھرنے والی کالی گھٹائیں جس بے دردی سے' میری امنگوں' آرزوؤں' ارمانوں کے خون پر کمربستہ نظر آتی ہیں ...... اس دکھ کا بوجھ میری ناتوانی تو کیا......... قبر کی مٹی بھی شائد! برداشت نہ کر سکے ....!!!''

☆☆☆

تقدیرِ اُمم

ہماری اور آپ کی عمر کے سبھی لوگوں کو' بچپن میں نانی' دادی کی سنائی ہوئی مافوق الفطرت اور سبق آموز کہانیاں' ابھی بھی یاد ہونا چاہئے! ہمارے بچوں کے پاس' وقت اور برداشت کا مادہ' الیکٹرانک میڈیا کے باعث کم نہ ہوتا تو ہماری روایات کی امین یہ کہانیاں وقت کی دھول میں اتنی جلد ہرگز گم نہ ہوتیں۔

ایک کہانی آج بھی ہمارے حافظے میں محفوظ ہے۔ مغل فرمارواؤں کے ایام میں بوقت نماز' محمود وایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہوا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اُس وقت کے پہنچے ہوئے مجذوب بھی شامل جماعت تھے۔ بادشاہ سلامت سمیت تمام نمازیوں نے اپنے اپنے دلوں میں نماز کی نیت باندھی جبکہ مجذوب نے با آواز بلند'' جو نیت امام کی وہ میرے قدموں کے نیچے'' کہہ کر نیت باندھ لی۔ بعد از نماز بادشاہ سلامت نے' مجذوب کو اسلام کی بے ادبی پر سر قلم کرنے کی سزا سنا دی جس پر آنا فانا عمل درآمد کرا دیا گیا۔ کہتے ہیں قلم ہونے کے بعد بزرگ کا سر' جلال کے عالم میں جامع مسجد دہلی کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اتنے میں مجذوب کے مرشد یہ خبر پا کر موقع پر پہنچ گئے۔ انہوں نے اپنے خلیفہ کو رک جانے کا حکم دیا۔ شنید ہے' مجذوب اپنے مرشد کے حکم کی تعمیل میں جہاں تھے وہیں رک گئے البتہ! مغل سلطنت کے زوال کی بددعا ضرور دے گئے۔

بزرگ کے مرشد نے پاکباز خلیفہ کو مصلوب کئے جانے کے واقعہ کی تفصیل جان کر

مسجد کی اُس جگہ کو کھودنے کا حکم دیا جہاں نماز ادا کی گئی تھی۔ وہاں سے بھاری مقدار میں خزانہ برآمد ہوا جس کے بعد امام صاحب کو طلب کر کے دریافت کیا گیا تو انہوں نے بتلایا کہ میں جب نماز کی نیت کر رہا تھا تو میرے دل میں اپنی دو نوجوان بیٹیوں کی صورتیں اُبھر آئیں جن کی شادیوں کے لئے میں پریشان تھا۔ میں نے سوچا! آج خوش الحانی سے کوئی ایسی سورت کی تلاوت کروں کہ بادشاہ سلامت کا دل موم ہو جائے اور بادشاہ سلامت خوش ہو کر انعام واکرام سے نوازیں تو جوان بیٹیوں کی شادی کی سبیل نکل آئے۔

نمبردار کی پاٹ دار آواز پر سب لوگ باہمی گفتگو درمیان میں چھوڑ کر مولوی صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے صفیں بنانے میں مصروف ہو گئے۔ خیر و شر کے موضوع پر مختصر وعظ کے بعد نماز کی نیت' ترکیب اور صفوں کی تعداد کو'' طاق'' تین' پانچ' سات میں رکھنے کی تلقین کرتے ہوئے مولانا صاحب نے اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ باندھ لئے جن کی پیروی میں تمام مقتدین نے کانوں کی لوؤں کو چھوتے ہوئے دل میں نماز کی نیت کر کے ہاتھ باندھ لئے۔ تیس اور پینتیس سال کی عمر کے دو اذہان جسمانی طور پر نماز میں شریک اور ذہنی طور پر دنیاوی سوچوں میں گم تھے۔

''ہاں بھئی خیریت تو ہے!'' حقے کی نے کو منہ میں دبا کر نواب اللہ یار خان نے بھرپور گڑگڑاہٹ کے ساتھ ایک لمبا کش لے کر دھواں باہر نکالتے ہوئے دونوں بیٹوں کو اپنے کمرے میں خوش آمدید کہا۔

''ابا جی! وہ دراصل............''

''ہاں ہاں! بولو رک کیوں گئے۔''

''تم کہونا............!'' بڑے نے چھوٹے کی پسلیوں میں کہنی بھونکتے ہوئے ترغیب دی۔

''بھائی' فصل کی بابت کچھ کہنا چاہتے ہیں۔'' چھوٹے کی جرأت نے بات کا آغاز کیا۔

''فصل پک گئی اور بک بھی گئی..........ہم لوگ اس بار کتنا خوش تھے۔ آم کی فصل اچھی ہونے پر......ہمارا خیال تھا اس بار کی فصل سے اتنی رقم اکٹھی ہو جائے گی جس سے سارے مسائل حل ہو جائیں گے..........جبکہ فصل کی رقم سے قرض کی ادائیگی بھی ناممکن ہے۔''

نواب صاحب اور بچت دو متضاد باتیں تھیں۔ نواب صاحب کی گھٹی میں روپے پیسے سے انس شامل ہوتا تو نواب صاحب مقروض کیوں ہوتے؟ نواب صاحب کی شخصیت ہشت پہلو بھی ہے اور ہمہ گیر بھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نواب صاحب اپنی ذات میں انجمن' ادارہ' گھنی

چھاؤں کی مانند تھے۔ جن کی عظمت کا ہر کوئی اقرار کر کے فخر محسوس کرتا تھا۔ خدا نے نواب اللہ یار خان کو دردمند دل اور روشن ضمیر دیا تھا۔ اپنی ضرورت کی بابت ہر کوئی فکرمندی میں مبتلا رہتا ہے۔ کم کم لوگ دوسروں کی ضروریات کی بابت سوچتے اور اس کا حل تلاش کرتے ہیں۔

نواب صاحب نے بتیس سال کی تحصیلداری میں، نیک نامی اور عزت کے سوا کچھ بھی نہ کمایا تھا حالانکہ ذرا سی تگ و دو کے بعد وہ کتنے ہی گاؤں کے مالک بن کر اپنی آل اولاد کا مستقبل سنوار سکتے تھے۔ نواب صاحب نے تحصیلداری کے باوجود اپنی زمین اور باغات میں اضافے کے بجائے خاصی کمی کر لی تھی مگر خاندانی وضعداری کو اُسی ٹھسّے سے نبھایا جو اُن کے بزرگوں کا وطیرہ اور اُن کے عہدے کا متقاضی تھا اس کے باوجود دو مربعے نہری زمین اور چار باغ آموں کے اور آم بھی انور رٹول کے ہونے کے باوجود تنگدستی کا سامنا رہتا۔ اکثر قرض لینے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا۔

''جوانی بڑی خوبصورت چیز ہے۔ خون کی گرمی البتہ! وقت بے وقت اور بلا سبب آدمی کو تشویش میں مبتلا کر دیا کرتی ہے۔ میاں! جو قرض ہم پر واجب ہے یہ ہم نے اپنی ذات کی بابت قطعی نہیں اٹھایا۔ اصل میں چند سفید پوش مہربان اپنی مجبوریوں کے باعث ہمارے آگے دستِ سوال دراز کر بیٹھے۔ اپنی گرہ خالی ہونے کے باوجود ہماری وضعداری نے انکار سے باز رکھا۔ آپ لوگ کسی فکرمندی میں مبتلا نہ ہوں۔ ایک صاحب اپنا شہر والا مکان فروخت کرنے کی جستجو میں ہیں۔ دوسرے کا باہر سے ڈرافٹ آنے والا ہے۔ تیسرے صاحب نے گنّے کی فصل کا وعدہ کیا ہے اور دیگر دوست بھی جلد ہی بندوبست کرنے والے ہیں۔

نواب صاحب کی وضعداری نے اُن کے گھر کو، گاؤں کے بڑے ڈیرے میں تبدیل کر دیا تھا۔ جہاں ہر وقت محفل جمی رہتی جس میں بلا تخصیص گاؤں کے سبھی طبقے شریک ہوتے۔ حاجت مندوں کی آمد کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ ایک بات اہم اور بھی بتانے والی ہے! نواب صاحب کبھی کسی دوست یا مہمان کے سامنے حاجت مند کی مدد نہ کرتے۔ آنے والے کے چہرے پر پریشانی اور جانے والے کے رخساروں پر خوشی کے آثار سے اہلِ محفل، اپنے اپنے انداز میں قیافے لگایا کرتے۔ طریقۂ کار کچھ یوں تھا، شرکائے محفل کی طرح ------ حاجت مند آیا اور بیٹھ گیا جہاں باقاعدگی سے حقہ، اخبار، ریڈیو اور موسمی پھل مہیا کئے جاتے۔ ہر گھنٹے بعد چائے کا دور لازمی تھا۔ ملازمت کا ایک تمغہ چائے کی لت، نواب صاحب نے

سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ خود بھی کثرت سے چائے پیتے' آنے والے مہمانوں کو بھی اصرار سے پلاتے۔ یہ ناممکن تھا! آپ نواب صاحب کی محفل میں جائیں اور چائے سے لطف اندوز نہ ہوں۔ چائے سے انکار کا مطلب نواب صاحب کی دل آزاری تھی۔ آنے والے کی مرضی پر منحصر ہوتا کہ وہ اخبار کی چٹ پٹی خبروں سے استفادہ کرے' ریڈیو سے دل بہلائے' حقے کے چھوٹے یا لمبے کش لے کر نواب صاحب کے ارغوانی تمباکو کی داد دے یا موسمی پھل کا پوسٹ مارٹم کرتے ہوئے شریکِ گفتگو ہو کر اپنی قابلیت کا لوہا منوائے۔

ہلکی پھلکی گپ شپ اور ملکی سیاست سے فصلوں' موسم اور موت فوت کے بعد چائے کا دور لازمی ہوتا۔ جس کے دوران نواب صاحب اپنی کرسی کا رخ دھوپ کی جانب کرتے ہوئے' سر سے ترکی ٹوپی اتار کر اپنی گود میں رکھ لیتے اور چائے کا کپ تپائی پر رکھ کر ایک ہاتھ سے سر سہلاتے اور دوسرے ہاتھ سے ترکی ٹوپی کے پھندنے کو سیدھا کرتے ہوئے دریافت کرتے! ''ہاں بھئی فلاں! خیریت تو ہے' تمہاری بھینس کا کیا حال ہے سونٹھ اور پرانا گڑ کھانے کے بعد پیٹ کا درد ٹھیک ہوا کہ نہیں۔ تم ایسا کرو! دونوں چیزوں کے ہم وزن اجوائن بھی شامل کر لو انشاء اللہ تمہاری بھینس بھلی چنگی ہو جائے گی۔ اور ہاں بھئی کیا نام ہے تمہارا! تمہاری فصل کو جنگلی سوروں نے جو نقصان پہنچایا تھا اب تو نہیں آتے۔ میں نے محکمہ بے رحمی والوں کو سختی سے اُن کا قلع قمع کرنے کی تاکید کی ہے۔ اور میاں! تم نے تو وعدے کے باوجود اُس دن کے بعد سے مسجد میں شکل ہی نہیں دکھائی۔ بھلے آدمی ....!'' قصہ مختصر اشاروں کنایوں میں' نواب صاحب خود ہی سلسلہ کلام آگے بڑھاتے۔ مخاطب ضرورت مند ہوتا تو گول مول طریقے سے مدعا بیان کرنے کی کوشش کرتا جس پر نواب صاحب' بس بس کہہ کر مدمقابل کو ہاتھ کے اشارے سے خاموش کرا دیتے۔ یہ ایک طرح کا گرین سگنل تھا کہ نواب صاحب اُس کا مدعا جان گئے ہیں۔ آنے والا خود نہیں آیا ضرورت اُسے کھینچ لائی ہے۔ کوئی اپنی ضرورت کسی کے سامنے بیان کرے یہ نواب صاحب کو گوارہ نہ تھا۔ حاجت مند کو ایک طرف لے جا کر سرگوشی کرتے پھر بیٹھک سے ملحقہ کمرے میں جا کر واپس آتے اور مذکورہ شخص سے گرم جوشانہ مصافحہ کرتے ہوئے اُسے رخصت کرتے۔ جانے والے کے چہرے پر خوشی کی لالی اور باآوازِ بلند سلام کی گرمجوشی سے لوگوں کو اُس کی کامیابی کا اندازہ ہوتا۔

کچھ لوگ اس روٹین کے عادی تھے اور دل ہی دل میں' نواب صاحب کی اعلیٰ ظرفی کو سراہتے تھے۔ کچھ اس ٹوہ میں لگے رہتے کون آیا ہے؟ کیوں آیا ہے؟ نواب صاحب

نے کیا دیا ہے؟ کب دیا ہے؟ کتنا دیا ہے؟ ملک نوروز خان سے ایک دن ضبط نہ ہو سکا۔
''نواب صاحب! آپ مردانے سے اُٹھ کر کیوں جاتے ہیں۔ مانگنے والے بھی مرد ہوتے ہیں پھر پردہ کیسا؟'' نوروز خان تھانیداری سے ریٹائرڈ ہو چکے تھے۔ اکڑفوں اب بھی وہی تھی۔ لہجہ کی کرختگی بھی نہ گئی تھی۔ جسے نواب صاحب نے بھی محسوس کیا۔ ضبط کرتے ہوئے بولے!

''عیب پوشی نہیں کر سکتے تو چشم پوشی ہی کر لیا کرو۔''

تھانیداری نے نوروز خان کو منہ پھٹ بنا دیا تھا۔ نواب صاحب کے جواب سے نوروز خان پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ ایک رنگ آتا ایک جاتا تھا۔ اذان کی آواز پر نماز پڑھنے کا کہہ کر خاموشی سے اجازت لے کر چلے گئے۔ حالانکہ! گاؤں کے سبھی لوگ اُن کی گنڈے داری سے بخوبی واقف تھے۔ مدت سے نواب صاحب کا اصول تھا کہ آم کی فصل پکنے پر بڑے پیمانے پر دعوت کا اہتمام کرتے اور دعوت کے اختتام پر مہمانوں کی خدمت میں آموں کی پیٹی کا تحفہ بھی پیش کیا جاتا۔ چونکہ نوروز خان اُس دن کے بعد شرمندگی کے باعث نواب صاحب کی محفل میں نہ آئے تھے جس کا نواب صاحب کو افسوس تھا کہ انہوں نے نوروز خان کی سخت الفاظ میں سرزنش کی تھی جو کہ غلط طریقہ تھا۔ نواب صاحب نے دعوت کی مناسبت سے اپنے خاص کارندے' نوروز خان کو بلانے کے لئے روانہ کیا۔ شائد! نوروز خان بھی اسی بلاوے کے منتظر تھے۔ انہوں نے بھری محفل میں نواب صاحب سے اُس روز کی غلطی کا اعتراف کر کے سب لوگوں کو حیرت زدہ کر دیا۔

''صبر کرو بیٹے' صبر کرو! اللہ کی یہی مرضی تھی۔ اُسی کی مرضی کے آگے انسان قطعی بے بس ہے'' دونوں کی آنکھوں میں مدمقابل کو دیکھ کر اُمید کی کرن پیدا ہوئی۔ دونوں استفہامیہ نظروں سے اپنے والد کے انتہائی قریب اور راز دار دوست کو دیکھنے لگے۔ تعزیتی رسمی جملوں کی ادائیگی کے بعد وہ صاحب آگے بڑھ گئے اور اُن کی جگہ دوسرے صاحب نے لے لی۔ یہ بھی مرحوم نواب صاحب کے بہت قریبی دوستوں اور مصاحبوں میں شمار ہوتے ہیں۔

''میاں! میں تو یہ سوچ کر پریشان ہو رہا ہوں کہ شام کے وقت' نواب صاحب مکئی کے کھیتوں میں کرنے کیا گئے تھے اور سانپ نے گھوڑے کے بجائے نواب صاحب کو ہی کیوں ڈسا؟''

''ابا جی پرتاپور سے پھوپھو کی بیٹی کی نسبت طے کر کے لوٹ رہے تھے۔ پھوپھا اور پھوپھو نے انہیں روکنے کی بہت کوشش کی .... مگر .... قدرت کی طرف سے ان کا بلاوا آ گیا تھا۔''

''ہائے ہائے! کیا نستعلیق آدمی تھا تمہارا باپ! انسان کے روپ میں فرشتہ تھا فرشتہ۔''

تیسرے صاحب کی گفتگو میں اتنی شفقت اور مٹھاس تھی کہ نواب اللہ یار خان کے دونوں بیٹوں کے ذہنوں میں امید کے قمقمے جل اٹھے۔ ان صاحب کی طرف بھی وہ اُمید افزا نظروں سے دیکھنے لگے۔ انہوں نے بھی اظہارِ افسوس کے علاوہ ایک لفظ اضافی نہ کہا۔ اسی طرح نواب صاحب کے سارے قریبی دوست' احباب' مصاحب ایک ایک کر کے دونوں صاحبزادوں سے تعزیت کر کے آگے بڑھتے رہے اور نواب صاحب کے بیٹوں کی تشویش میں اضافے کا سبب بنتے رہے کیونکہ نواب صاحب کا اصول تھا لینے اگر لاکھوں ہیں تو کسی کو پتا نہیں اور دینے چند روپے بھی ہیں تو گھر کے ہر فرد کو بار بار تنبیہہ کی جاتی ''بھئی میں نے فلاں کی اتنی رقم ادا کرنی ہے۔''

گاؤں کے بوڑھے' بچے اور جوان' نواب صاحب کی قبر کو مٹی دے رہے ہیں۔ گورکنوں کو ایک طرف کر کے نوجوانوں نے پھاؤڑے اور بیلچے خود ہی اٹھا لئے ہیں۔ منٹوں' سیکنڈوں میں مٹی کا پہاڑ نواب صاحب کے تنِ ناتواں پر ڈھیر کی شکل میں نمودار ہو گیا ہے۔ نواب صاحب کے خادم خاص علی بخش نے' نواب صاحب کے ہاتھوں لگے موتیا کے پودے کی ایک شاخ کو حویلی کے صحن سے توڑ کر اُن کی لحد کے درمیان میں لگا کر نواب صاحب سے محبت کا ثبوت اور اُن کی پیروی میں صدقۂ جاریہ کا آغاز کیا ہے۔ بہت سے لوگوں نے رنگ برنگے' خوشبو دار پھولوں کی چادروں سے نواب صاحب کی قبر کو ڈھک دیا ہے۔ نواب صاحب کے بھانجے شہزاد علی نے اگربتیوں کے کئی پیکٹ کھول کر نواب صاحب کے علاوہ گرد و پیش کی قبروں کے مکینوں کو زندہ لوگوں کی موجودگی کا احساس دلایا ہے۔

مولوی صاحب بڑی دلسوزی اور رقت سے نواب صاحب کے لئے دعائے مغفرت کرا رہے ہیں۔ دعا کے دوران نواب صاحب کے اوصافِ حسنہ کا بار بار ذکر کر کے لوگوں کو اُن کی پیروی کی تاکید کے بعد دوسرے دن نواب صاحب کی حویلی پر ''قُل'' کی فاتحہ خوانی کے اعلان کے ساتھ با آوازِ بلند ایک اعلان اور بھی کیا جا رہا ہے۔ ''نواب صاحب (مرحوم) کے ساتھ جن صاحب کا مالی لین دین یا کسی اور قسم کا حساب کتاب ہو وہ سامنے آ کر

بلند آواز میں اُس کا اعلان کریں۔''

مولوی صاحب نے مذکورہ اعلان بلند آواز سے دوسری بار دُہرایا۔ ایک بار پھر نواب صاحب کے دونوں بیٹوں کے چہروں پر اُمید کی کرنیں نمودار ہوئیں۔ دونوں بیٹوں نے اُمید وبیم کے کیفیت میں مجمع کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک غور سے دیکھا جس میں بہت سے شناسا چہروں پر ہوائیاں اُڑی ہوئی تھیں.......... آہستہ آہستہ مجمع چھٹنے لگا ہے۔ نواب صاحب کے دونوں بیٹے بوجھل قدموں سے' باپ کی قبر کو حسرت سے دیکھتے ہوئے گھر کی جانب واپس پلٹنے لگے ہیں جبکہ ملک نوروز خان غصہ سے کبھی مجمع اور کبھی نواب صاحب کے بیٹوں کی جانب دیکھتے ہوئے منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگے ہیں......؟؟

چارلی

ہمارا شمار بڑبولوں میں ہوتا ہے نہ انگریزی کے لفظ Over Clever کی تعریف پر ہم پورا اُترتے ہیں۔ خوش فہمی کی رعایت انسان کا بنیادی حق ہے چنانچہ ہمیں بھی اپنی ذہانت اور عقل مندی کا کچھ کچھ ادراک ہے۔ گردوپیش کے محسوس وغیرمحسوس جبر کے باعث ہمارے دماغ کو پریشر کُکر کے مماثل قرار دیا جاسکتا ہے۔ جس میں نت نئے منصوبے' خیالات وخواہشات' وقت بے وقت سر اُبھارتے رہتے ہیں اور اُن کے بخارات راستہ نہ ملنے کے باعث دل ودماغ میں عجب طرح کا تغیر برپا کئے رکھتے ہیں۔ خوش نصیبی کہ ابھی تک اندرونی بخارات کے پریشر سے' ہمارے سر کے پرخچے نہیں اُڑے البتہ! گاہے بگاہے نوزل سے اِس شدت کے بخارات خارج ہوتے ہیں کہ خود پر قابو نہیں رکھ پاتے۔ بعض اوقات اتنے منہ پھٹ اور بدلحاظ ہوجاتے ہیں کہ ہمیں خود بھی اپنی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ پر ندامت کا احساس ہوتا ہے۔ انسان کے اطراف میں' سوجن اور دشمن ہوا کرتے ہیں۔ خدا جانے' کون کب کس طرزِ عمل کا اظہار کرے اس کی بابت آپ کے اندازے ہمیشہ درست نہیں ہوتے۔

عزیز واقارب' دوست احباب اور پاس پڑوس والے' ہماری زبان کی لمبائی سے پہلے ہی بدکے ہوئے تھے۔ اب تو دُوردراز میں بھی ہمارے اکھڑ لہجے اور کھردرے الفاظ کی گونج سنائی دینے لگی ہے۔ کل ہی کی بات ہے' شرکائے محفل پڑھے لکھے' مہذب اور ذمہ دار لوگ تھے۔ کھانے کی میز پر' قومی اور بین الاقوامی موضوعات پر گفتگو کا سلسلہ کھانے کی لذت کو بڑھاوا دے رہا تھا۔ ہمارے

دائیں جانب بیٹھے مرنجاں مرنج صاحب نے، نظر کی عینک کے دبیز شیشوں سے دونوں آنکھوں کے ڈھیلے باہر نکالتے ہوئے، بائیں ہاتھ پر بندھی رسٹ واچ میں بغور دیکھتے ہوئے میزبان سے خبریں سننے کی فرمائش کی جس پر لہجے میں شیرینی پیدا کرتے ہوئے میزبان نے فوراً عمل درآمد کیا۔

صاحب! ''نوبل پرائز'' خالہ جی کے گھر پر دستیاب ہے نہ نانا جی کی فاتحہ پر بٹتا ہے۔ بڑے بڑوں کا پتّہ اس کی خواہش میں پانی ہو جاتا ہے اس کے باوجود وہ کسی شمار قطار میں نظر نہیں آتے۔ بہت سے، تمام زندگی ڈھنگ کا کوئی کام کرنے کے بجائے اس انعام کو حاصل کرنے کی خواہش، جستجو، پلاننگ اور لابنگ میں گزار دیتے ہیں۔ انعام کے بلاوے سے پہلے موت کا بلاوا اُن کے دروازے پر دستک دینے لگتا ہے۔ اقوامِ متحدہ کے رئیس اعظم! میاں کوفی عنان کو یہ ایوارڈ عطا ہوا ہے تو اس کے پیچھے ٹھوس، وزنی عوامل اور کارگزاری کا ہونا یقینی بات ہے۔ ہم کون ہوتے ہیں رائے زنی کرنے والے ہماری رائے اور ہماری ذات کیا معنی رکھتی ہے؟۔ تاریخ میں کسی محکوم قوم کے فرد کی رائے کو کبھی اہمیت دی گئی ہوتی تو بھی کوئی بات تھی ...... !

اب ہم آپ سے کیا عرض کریں اور کیسے کریں۔ مارے خوف کے سارا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا ہے چونکہ آپ کا بہت سا وقت ہمارے کھاتے میں پڑ چکا ہے کیوں نا اُس کی قیمت اپنی منہ پھٹی کے چند واقعات سنا کر ادا کر دی جائے ...... سجاد کے ابو، حلیم الطبع اور شیریں دہن بزرگ تھے۔ بیگم مرحومہ کے چہلم پر افطار میں دہی بڑے بنانے کی تجویز، مہمان نوازی کی دلیل تھی۔ ہماری زبان کی کمان جھٹ سے تن گئی، تڑاخ سے تیر داغ دیا۔ ''انکل جی! دہی بڑے تو بس ماش کی دال کے چٹخارہ دیتے ہیں۔'' اللہ توبہ! لفظ چٹخارے پر سجاد نے، جن نظروں سے ہماری طرف دیکھا، اُس وقت سجاد کی جگہ دوسرا کوئی شخص ہوتا تو مہابھارت چھڑ گئی ہوتی۔ خالد عزیز نے داڑھی رکھ کر، نیکی کی طرف پہلا قدم بڑھایا۔ تمام احباب نے خالد کے اِس عمل پر اُسے خوب حوصلہ دیا اور مستقبل کے لئے نیک خواہشات کا اظہار بھی کیا جبکہ ہماری زبان کی لگامیں، وحشت سے بے قابو ہو گئیں۔ ''میاں داڑھی واڑھی سب ڈھکوسلا ہے، اصل معاملہ کرتوت چھپانے کا ہے'' قبل اس کے خالد ہماری شان میں کفر تولتا! بھلا ہو منظور صاحب کا وہ موقع کی مناسبت کو بھانپتے ہوئے، گھنٹے والے کے بالائی دار، سوندھے دودھ کا لالچ دے کر ہمیں منظر سے ہٹا گئے۔ سچے مسلمان، خالص پٹھان، بہادر فوجی اور پکے لاف زن بہادر خان کے پوتے کی پیدائش پر ہمارا بے رحمانہ تبصرہ ''لڈو تم ہم ضرور کھائیں گے خان صاحب بلکہ دعوت بھی مگر یہ بھی ضرور دریافت کریں گے کہ چھٹے مہینے میں، نتیجہ کب سے برآمد ہونے لگا؟'' مالی نقصان مبلغ یک صد روپیہ سکہ رائج الوقت تک محدود تھا جو کہ خان صاحب نے طیش میں

آنے کے بعد مٹھائی کے ڈبے پر اُتارا تھا۔ تعلقات میں شگاف کافی گہرا پڑ گیا تھا۔ جسے دوستوں اور بہی خواہوں کی کوششیں بھی پُر نہ کرسکیں۔ اوائل عمر میں فنون لطیفہ کی للک کے باعث' سیاست سے بے زاری کا عنصر ہماری طبیعت میں ابھی بھی نمایاں ہے۔ نہ جانے رضا صاحب کے لہجے کی تاثیر تھی یا سیاست دان موصوف کے نام کی کشش' رضا صاحب کے ہمراہ اُن کی پسندیدہ پارٹی کی سیاسی میٹنگ میں چلے گئے جہاں اُن کی پارٹی کے سربراہ نومولود پارٹی کے اغراض و مقاصد دھیمے اور شستہ لہجے میں بیان فرما رہے تھے۔ ذہن میں لگنے والے پُرانے چرکے کا اثر ابھی بھی محفوظ تھا۔ جس کے زیر اثر ہماری زبان کمانی کی طرح تن گئی۔

''جنابِ والا! آپ اس وقت درست فرما رہے ہیں یا آپ کا طرزِ عمل اُس وقت صحیح تھا جب آپ ملک کی نامور عوامی پارٹی کے پُر جوش لیڈر کے طور پر ہمارے شہر میں جلسۂ عام سے خطاب کر رہے تھے۔ آپ نے تقریر کا آغاز کرتے ہی اپنے قریبی حریف کو خان زادہ کے بجائے حرام زادہ کے لقب سے نوازا تھا۔'' محفل' ہمارے استفسار پر بھونچکا رہ گئی۔ تمام افراد' سوالیہ نظروں سے رضا صاحب کی جانب گھورنے لگے جس کے بعد لیڈر مذکور نے زباں دانی کے جوہر اور رضا صاحب نے خفیفانہ ہتھیاروں کا استعمال کیا۔ قصہ وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں جب ہر طرف سرچارج لگ رہا تھا۔ ہمارے اک سابق وزیرِ خزانہ' ادبی ریفرنس کی صدارت فرما رہے تھے۔ میزبان اُن کی تعریف میں لفظوں کا بے جا استعمال کرتے ہوئے وزیر موصوف کو اپنا سرتاج گردان رہے تھے' بے ساختہ ہمارے منہ سے یہ جملہ خطا ہو گیا'' سرتاج نہیں جناب! وزیر سرچارج کہئے۔''

ویسے تو ہمیں اپنی اعلیٰ ذوقی اور زباں دانی کا بڑا گھمنڈ ہے۔ موقع' مناسبت اور مروّت سے ہماری واجبی آشنائی ہے۔ ہمارے بیٹے کی سلامی پر اصغر علی ایک سوایک روپیہ دے رہا تھا جسے لینے پر ہم قطعی تیار نہ تھے۔ اصغر علی کافی دیر' ہمارے انکار کا سبب نہ جان سکا اور ہماری ٹھوڑی میں ہاتھ ڈال کر اپنی دی ہوئی سلامی قبول کرنے پر زور دیتا رہا جب اُسے ہمارے لب ولہجہ کا اندازہ ہوا تو اُس نے صاف صاف کہہ ڈالا'' یار اس میں نخرے کی کون سی بات ہے۔ تُو نے بھی تو میرے بیٹے کی سلامی پر ایک سوایک روپیہ دیا تھا۔'' '' میاں! اُس وقت سو روپے میں دس ڈالر آتے تھے۔ اب تو دو بھی نہیں آتے!''

اب تک آپ ہماری منہ پھٹی سے کافی مرعوب ہو چکے ہوں گے۔ ہماری زبان آپ کے سامنے' ایک سچ بیان کرنے کو مچل رہی ہے۔ ہماری منہ پھٹی اور زبان درازی وہیں تک محدود ہے جہاں تک ہماری سلامتی یقینی رہتی ہے۔ بہت سے مواقع اور شخصیات کی بابت ہماری زبان میں کھجلی

بہت ہوتی ہے الفاظ البتہ! کانٹے بن کر حلق میں پھنسنے لگتے ہیں۔ مثلاً ہمارے ایک کرم فرما اور مہربان نواب صاحب ہم سے ذرا فاصلے پر رہتے ہیں۔ آپ تو اچھی طرح واقف ہوں گے اُن سے بلکہ ہم سب ہی اُن کے ممنونِ احسان ہیں۔ خدا نے اُن کو شیر کا دل اور چیتے کا جگر فراہم کیا ہے۔ کثرت' پہلوانی' دنگل' ہلہ گلہ اور میلوں' ٹھیلوں سے اُنہیں بہت شغف ہے۔ پرانے زمانے میں امراء' نواب' راجے' مہاراجے اور بادشاہوں کے حرم ہوا کرتے تھے جبکہ نواب صاحب نے ہر نسل اور رنگ کا نادر و نایاب پالتو پال رکھا ہے۔ جگہ جگہ چھوٹے بڑے چڑیا گھروں میں اُن کی پرورش بڑی ہنرمندی سے کی جارہی ہے۔ نواب صاحب کی آمد یا طلبی پر یہ تمام جانور' کورنش بجالاتے ہیں نواب صاحب کے ہر حکم اور فرمان کو اپنا نصیب جان کر خوشی سے رقص کرنے لگتے ہیں۔

آج کل نواب صاحب کے ''چارلی'' کا بڑا چرچا ہے۔ ہونا بھی چاہئے۔ چارلی جس محنت' جانفشانی اور وفاداری سے نواب صاحب کی خدمت داری پر لگا ہوا ہے اُس کے عوض' چارلی اس سے بھی بڑے سلوک کا مستحق ہے۔

چارلی ہمیشہ سے نواب صاحب کی تابعداری میں نہیں ہے۔ کافی عرصہ پہلے نواب صاحب اپنے عالی مرتبت دوست کی دعوت پر مدعو تھے۔ جہاں میزبان نے نواب صاحب کی مدارات کی تمام تدبیروں کے علاوہ اپنے پالتوؤں کے کرتب سے بھی نواب صاحب کی تفریح وطبع کا اہتمام کیا۔ نواب صاحب چارلی کے کرتب وکمال کے اس قدر گرویدہ ہوئے کہ ہر قیمت پر میزبان سے چارلی کو حاصل کرنے کی فرمائش کر بیٹھے۔ میزبان کے لئے یہ امر دلچسپی کے ساتھ حیرت کا باعث بھی تھا کہ نواب صاحب ایک بندر کے لئے اس قدر جذباتی کیوں ہو رہے ہیں۔ میزبان کو اس بات کی بھی فکر تھی کہ وہ فوری طور پر چارلی نواب صاحب کو تحفے میں دے دیں گے تو اپنے چڑیا گھر کا انتظام و انصرام اور نگرانی کس کو سونپیں گے؟ بظاہر چارلی ایک معمولی بندر تھا مگر اُس کی ذہانت اور چالاکی کے باعث میزبان نے پورے چڑیا گھر کی ذمہ داری چارلی کو سونپی ہوئی تھی۔ میزبان نے مہمان کی فرمائش کے احترام میں ایک ترکیب نکالی۔ میزبان کی خواہش کی تکمیل کے لئے کچھ دنوں کی مہلت مانگ لی اور چارلی کی والدہ کی زچگی سے فراغت کے فوری بعد اک تروتازہ نومولود چارلی اپنے معتبر دوست کی خدمت میں پیش کر دیا۔

نواب صاحب پالتوؤں کو سدھانے اور تابعدار بنانے میں پہلے سے ماہر تھے۔ تھوڑے عرصے کی توجہ' تربیت کے بعد تازہ دم اور نومولود چارلی پُرانے چارلی سے زیادہ دلکش' چونچال اور پھرتیلا ہو گیا۔ وہ ہر روز صبح اٹھ کر' نواب صاحب کو فرشی سلام کرتا اور نواب صاحب کی جانب سے

روغنیات کی غذا کھا کر دونوں ٹانگوں پر کھڑا ہو کر ناچنے لگتا۔ اکثر بالائی والا پراٹھا کھا کر نواب صاحب کی پھینکی ہوئی گیندوں کو پلک جھپکتے میں اٹھا اٹھا کر لاتا اور جہاں جہاں نواب صاحب اشارہ کرتے ٹھیک ٹھیک نشانہ پر مار آتا۔

تھوڑے ہی عرصے میں نواب صاحب کے ساتھ چارلی کی دھوم بھی دور دور تک جا پہنچی۔ کچھ لوگ نواب صاحب کی حیثیت کے گن گاتے کچھ طاقت سے مرعوبیت کا اظہار کرتے اور کچھ چارلی کی چستی، پھرتی کی بابت اشتیاق ظاہر کرتے۔ نواب صاحب پہلوانی، اکھاڑے، زور، میلوں، ٹھیلوں، دنگل، ڈھمول اور دیگر دھوم دھڑ کے علاوہ فصلوں کی کٹائی اور بٹائی کے موقعوں پر چارلی کو اپنے ہمراہ ضرور رکھتے جہاں چارلی کے نئے نئے سوانگ دیکھ کر لوگ لطف اندوز ہونے کے ساتھ نواب صاحب کی قربت اور چارلی کے التفات کی دل سے خواہش کرتے اور اپنا سب کچھ چارلی پر قربان کرنے کے لئے آمادہ ہو جاتے۔ ابتدا میں چارلی کے کرتب لوگوں کی تفریح طبع سے منسوب تھے جس میں ہر طبقہ فکر اور ہر سوسائٹی کے لوگوں نے اپنے قد سے بڑھ کر دلچسپی کا اظہار کیا۔ آہستہ آہستہ یہ کھیل تماشا، کاروبار میں تبدیل ہو گیا۔ پہلے پہل نواب صاحب نے قرب وجوار کے جیب تراشوں کی خدمات حاصل کیں۔ رفتہ رفتہ کاروبار کی وسعت کے پیشِ نظر دُور دراز کے بھی ماہر جیب تراشوں کو مناسب معاوضے پر بھرتی کر لیا گیا اور اُنہیں اِس امر کا پابند کیا گیا کہ وہ اپنا کاروبار اور خدمات نواب صاحب کو سونپ دیں اور ہر طرح سے نواب صاحب کی ہدایت کے پابند ہوں۔ جس کے عوض نواب صاحب اُنہیں نہ صرف اُن کی توقع سے بڑھ کر معاوضہ بلکہ معاشرے میں مناسب مقام بھی دلوائیں گے۔

وقت کے ساتھ ساتھ نواب صاحب کی مصروفیات اور کاروبار وسعت پانے لگا۔ میلوں، ٹھیلوں اور فصلوں کے علاوہ غم، خوشی، بیاہ، شادی اور لڑائی جھگڑے میں صلح صفائی یا بیچ بچاؤ کے لئے نواب صاحب کے ساتھ چارلی کا بھی اہم کردار ہوتا۔ چارلی کے کرتب اور نواب صاحب کی کروفر سے لوگ باگ جب بے خبر ہو جاتے تو نواب صاحب کے ماہر جیب تراش لوگوں کی جیبوں اور جمع جتھے پر ہاتھ کی صفائی دکھانے لگتے جس کا اندازہ اُنہیں بہت بعد میں ہوتا۔

نہیں صاحب! آپ کا اندازہ غلط ہے۔ نواب صاحب کے کاروبار میں ماہ وسال اور نظام الاوقات کو قطعی دخل نہ ہے۔ جوں جوں نواب صاحب کی طاقت کا دائرہ وسیع ہو رہا ہے وُوں وُوں نواب صاحب چارلی کو بھی نئے کرتب اور نئے سانچوں میں ڈھال رہے ہیں۔ اب وہ جھک کر آداب بجالانے، دونوں ٹانگوں پر کھڑا ہو کر ناچنے اور خوشی کے موقعے پر تالیاں بجانے کے ساتھ سر پر

سہرا سجا کر اور منہ پر رومال رکھ کر دولہا بن جاتا اور لوگوں سے سلامی وصول کرتا ہے کبھی کبھی اس طرح بے سود ہو کر زمین پر لیٹ جاتا ہے کہ اُس پر مُردے کا گمان ہونے لگتا ہے وقت پڑنے پر توپ' تفنگ اور تیر چلانے کا مظاہرہ بھی کرتا ہے۔ شرط! آپ کی مالی استعداد ہے یعنی جتنا گڑ آپ مہیا کر سکیں' چارلی اُتنا ہی میٹھا فراہم کرنے کا پابند ہے۔ چارلی کے کھیل سے لطف اندوز ہونے پر کوئی قدغن نہ ہے۔ دیکھنے والا آنکھ کا اندھا اور گانٹھ کا پورا ہونا ضروری ہے۔

نانا نا! نواب صاحب کے پرانے کرم فرما اور اُن کے چارلی کا ذکر ہرگز نہ کیجئے گا۔ وگرنہ آپ کی ذہانت پر ہمارے علاوہ نواب صاحب کو بھی شک گزر گیا تو آپ کے ساتھ آپ کی نسلوں کا مستقبل تاریک ہو سکتا ہے۔ ایک وقت میں ایک ہی تلوار نیام میں سما سکتی ہے اور یہ تلوار! سو تلواروں پر بھاری ہے اس کے لئے تو پہلے ہی موجود نیام ناکافی ہے۔

میاں! جانے بھی دیجئے۔ کیوں ہمیں کانٹوں میں گھسیٹتے ہیں۔ ہم ٹھہرے نکے مار قلمکار' ہمارا کام آپ کے وقت کا صحیح مصرف ہے سو ہم اپنی استعداد کے مطابق' دائیں بائیں دیکھ کر چوہے کی مانند بِل سے سر نکالتے اور آپ کی تواضع میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ہمیں اقوامِ متحدہ اور اُس کے چیئرمین سے بھلا کیا نسبت وہ جانیں اور اُنہیں ملنے والا امن کا نوبل پرائز............؟

یار! چھوڑو بھی' آپ بھی مذاق کو سچ سمجھ بیٹھے.........بات فقط ایک کہانی گھڑنے کی تھی سو ہم نے گھڑ ڈالی وگرنہ ہماری یہ مجال..................!!!!

☆☆☆

من مندر

نوجوانوں کی طرح، فسٹ کلاس کے کمپارٹمنٹ کے دروازے کے مخالف سمت، چم چم کرتے سٹیل کے راڈ کو پکڑ کر وجاہت حسین نے ڈبے میں قدم رکھتے ہی دھونکنی کی طرح، اوپر نیچے چلنے والی چھاتی کو پہلے پورا منہ کھول کر پھر ناک کے دونوں نتھنوں کو پھلا کر لمبے سانس لیتے ہوئے نارمل کرنے کی کوشش کی۔ اُس کے بعد واسکٹ کی بائیں سائیڈ کی اندرونی جیب میں دایاں ہاتھ ڈال کر ٹکٹ نکالا اور اُسی ہاتھ سے چشمہ درست کرتے ہوئے ٹکٹ پر چسپاں باریک نمبر کو سیٹ پر لکھے جلی ہندسوں سے میچ کرتے ہوئے اطمینان کا اظہار کیا اور اپنی پشت پر کھڑے ادھیڑ عمر قلی کو دو بیلٹوں میں مضبوطی سے جکڑے ہوئے کلیجی رنگ کے اٹیچی کو سیٹ کے نیچے رکھنے کی ہدایت کی جس کے بعد بھوسلے رنگ کے بستر بند کی جانب اشارہ کرتے ہوئے قلی کو برتھ کے اوپر رکھنے کا اشارہ کیا اور واسکٹ کی دونوں جیبوں کو ٹٹولنے لگے۔ جن میں سے دو مختلف رنگ کے نوٹ برآمد ہوئے۔ ایک قلی کی طرف بڑھا کر دوسرا جیب میں رکھنے کا سوچ ہی رہے تھے کہ اُن کی نگاہ، قلی کے شکن زدہ چہرے پر اٹک گئی جو دوسرے نوٹ کو اشتیاق سے دیکھ رہا تھا۔ وجاہت حسین نے جیب کی طرف بڑھا ہاتھ لوٹا کر قلی کی جانب دراز کر دیا جس کا چہرہ مارے خوشی کے اِس طرح کھل اٹھا جیسے روزِ حشر میں نجات کا پروانہ مل گیا ہو۔

قلی کو رخصت کرنے کے بعد وجاہت حسین نے پھر سے اپنے سامان پر نظر دوڑائی اور اطمینان میں سر ہلاتے ہوئے ہینڈ بیگ کی زپ کھول کر نقدی، ٹکٹ، گولیوں کے چند پتے اور کچھ

وزیٹنگ کارڈ' باری باری چیک کیئے۔سب چیزوں کو درست پا کر ہینڈ بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے پھر سے لمبا سانس لیا اور جسم کو ڈھیلا چھوڑ کر اپنی سیٹ پر دراز ہو گئے۔آہستہ آہستہ اعصاب پُرسکون ہوئے تو وہ کن انکھیوں سے ہمسفروں میں اپنی عمر اور ذوق کے آدمی تلاش کرنے لگے۔بائیں جانب ادھیڑ عمر کے دو تنومند اصحاب کاروباری گفتگو میں مصروف تھے اور اسٹاک مارکیٹ کے مندے پر اپنے اپنے زاویئے سے روشنی ڈال رہے تھے۔ایک کا استدلال امن و امان کی غیر یقینی کو ذمہ دار ٹھہرا رہا تھا جبکہ دوسرے کے خیال میں بیرونی فوجوں کی کاروائی مندے کا سبب تھا۔نقصان کی بابت دونوں کے خیال میں کافی حد تک یکسانیت تھی جو سیاہی مائل پیلاہٹ کی شکل میں دونوں کے چہروں پر نمایاں ہو رہی تھی۔کچھ دیر وجاہت حسین ان کی گفتگو دلچسپی سے سنتے رہے' مالیات سے عدم دلچسپی نے جلد ہی بیزاری میں مبتلا کر دیا اور وہ منہ پھاڑ پھاڑ کر جمائیاں لینے لگے۔وجاہت حسین نے سیٹ کی نرم پشت سے سر ٹکایا اور آنکھیں موند کر سونے کی کوشش کرنے لگے۔

خیالات کا سرا آپس میں جڑ تا ہی نہ تھا۔کبھی وہ پانچ برس کا شریر بچہ بن جاتے' کبھی پچاس برس کا سنجیدہ بزرگ' مختلف عمر اور ادوار کے قصے' کہانیاں' کردار آپس میں گڈمڈ ہونے لگے۔جب بھی ماضی کے کسی خوشگوار واقعے کی دہرائی سے وجاہت حسین کو سُرور آنے لگتا' خیالات کی لہریں بہا کر کہیں سے کہیں لے جاتیں۔پہلو بدل کر وجاہت حسین پھر سے یکسوئی حاصل کرنے کی کوشش کرتے اور ماضی کی انمول گھڑیوں سے کوئی سہانا لمحہ تلاش کرنے لگتے۔اس وقت وجاہت حسین بچپن میں کھیلے گئے ''لُکن مٹی'' کے عملی کھیل کو خیالی طور پر کھیلنے لگے۔ریل کی چھکا چھک خیالات پر حاوی تھی۔وجاہت حسین نے کمر کو جھٹکا دے کر وجود کو سیدھا کیا۔دونوں آنکھیں کھول کر چاروں اُور نگاہ دوڑائی۔اُن کی توجہ سامنے والے نوجوان پر مرکوز ہو گئی جو اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے مسافر کے اخبار کی سرُخیاں اُچک اُچک کے دیکھتا' ناپسندیدگی کا اظہار کرتا اور کمپارٹمنٹ کی چھت کو گھورنے لگتا۔جب وہ اپنے دوسرے ہاتھ بیٹھے سگریٹ نوش مسافر کی جانب دیکھ کر ہاتھ کے اشارے سے دھوئیں کو پرے دھکیلنے لگتا تو ناگاہ اُس کی نظر پھر سے اخبار کے صفحے پر مرکوز ہو جاتی۔خود کلامی کے انداز میں وہ بڑبڑ کرنے لگتا۔اخبار کے مالک نے تہہ کر کے اخبار اُس کی طرف بڑھایا اور موٹے شیشوں والی عینک بند کرتے ہوئے خوش اخلاقی کے مظاہرہ میں نوجوان کو اخبار پڑھنے کی دعوت دی تو اُس نے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے اخباری سرخیوں سے متعلق' سیاست دانوں کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔اخبار کے مالک کو اس سے اختلاف تھا۔وہ نوجوان کے خیالات کی نفی میں خطابت کے زور دکھانے لگا جس کے بعد اُن کے درمیان خوب زور کی سیاسی بحث ہوئی۔دونوں اپنے وقت کی بڑی سیاسی جماعتوں کے

حامی اور حمایتی نکلے۔ دونوں نے جی بھر کے ایک دوسرے کی پارٹی کے عیب گنوائے تمام خامیوں' خرابیوں کی ذمہ داری ایک دوسرے کی جماعت کے سر تھوپی۔ مناظرے کی شدت' کمپارٹمنٹ میں ویٹر کے داخلے سے کسی قدر مدھم ہوئی۔ لایعنی گفتگو اور سفری تھکان سے وجاہت حسین کا سر بوجھل ہو رہا تھا۔ سب سے پہلے انہوں نے ہاف سیٹ چائے کا آرڈر دے کر ویٹر کی مصروفیت کا آغاز کیا جس کے بعد کئی اور مسافروں نے ویٹر کو آواز اور اشارے سے اپنی جانب بلا کر چائے کے ساتھ اشیائے خوردونوش بھی طلب کیں۔

چائے والے کے بعد دال والے کا کاروبار زوروں پر تھا جو تیتر سے مشابہ آواز میں دال کے اوصافِ حسنہ گنوا رہا تھا جس میں مرغ کے ساتھ بارہ مصالحے' لیموں اور نجانے کس کس شے کا مرکب بتا کر مسافروں کے معدوں کو اشتہا دے رہا تھا۔ دال والے کے بعد بوتل والے نے فنی جوہر دکھائے۔ سرکس کے جوکر کی مانند ہاتھ' سر' آنکھیں مٹکا کر تمام برانڈ کی دستیاب بوتلوں کے نام اور اُن کے پینے کے فوائد گنوا کر مسافروں کی پیاس کو بھڑکایا جسے مسافروں نے قطعاً مایوس نہیں کیا۔ بوتل والے کے بعد منجن اور ہاضمے کی پھکّی والے کی باری تھی جو آنکھوں کے مختلف زاویوں کو ایک مرکز پر لاتے ہوئے کراری آواز میں' انسانی جسم کو لاحق تمام امراض مثلاً ہیضہ' بدہضمی' پیچش' کھٹی ڈکاریں آنا' بھوک نہ لگنا' جگر' معدے پر ورم آجانا وغیرہ کا علاج چٹکی بجا کر دو روپے کی پڑیا سے کر رہا تھا۔ ایسے ہی دعوے دو روپے والی منجن کی کراماتی پڑیا کی بابت بھی ہانک رہا تھا۔ اُس کے منجن کے استعمال سے دانتوں سے پیپ' خون آنا بند ہو جائے گا' پائیریا دور ہو جائے گا۔ منہ سے بدبو آنا بند ہو جائے گی۔ گرم' ٹھنڈا پانی لگنا دور ہو جائے گا۔ دانت موتی کی مانند چمکنے لگیں گے۔ اس کے بعد قینچی' چھری' چاقو' چمچ' کانٹے والا نمودار ہوا اور دونوں ہاتھوں میں چم چم کرتی چھریاں' چاقو' چمچ اور کانٹے لہرا کر اُن کی پائیداری اور استعمال کردہ قیمتی لوہے کے گُن اس مشاقی سے گنوانے لگا کہ سننے والوں کو اپنے اپنے گھروں میں سونے کے بجائے لوہا رکھنے کا شوق چرائے۔ چھری' چاقو اور قینچی والے کی چرب زبانی کے زیرِاثر اُس کی اچھی خاصی بکری ہو چکی تھی۔ اچانک کمپارٹمنٹ میں تیکھی اور کرخت آواز میں غلط تلفظ میں پڑھی جانے والی نعت کی صدا اُبھری۔ بظاہر یہ نوجوان فقیرنی اندھی تھی جس کے نیم برہنہ سینے سے چمٹا شیر خوار بچہ' ہمک ہمک کر مسافروں کو اپنی جانب متوجہ کر رہا تھا اور اپنی ماں کے کاروبار میں مفید ثابت ہو رہا تھا۔ آخر میں چندہ برائے مسجد کا صحت مند نمائندہ عمدہ تراش خراش' سر میں تیل اور آنکھوں میں سرمہ لگائے نمودار ہوا اور پاٹ دار آواز میں لوگوں کو دوزخ کے عذاب سے ڈرا کر چندہ وصول کرنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سب پھیری والوں کا دھندہ اِس شخص کے گلے کے سُر اور گراریوں

کے آگے ماند پڑ گیا۔ کمپارٹمنٹ کو رونق بخشنے والے سبھی پھیری والے آہستہ آہستہ غائب ہوتے گئے کیونکہ اگلے اسٹیشن سے دوسرے ٹھیکیدار کا علاقہ شروع ہونا تھا۔ صرف چائے والا موجود تھا جو چائے کی ٹرے کے ساتھ کیک کی پلیٹ بھی آگے بڑھا رہا تھا۔ وجاہت حسین کے آگے چائے کی ٹرے سجانے کے بعد چائے والے نے سامنے کی رو میں نکڑ والی سیٹ پر بیٹھے خوش پوش شخص کے آگے چائے کے ساتھ چینی بڑھانا چاہی تو اُس نے ہاتھ کے اشارے سے چینی اور کیک ہٹانے کو کہا۔ ویٹر اشارہ نہ سمجھا تو اُس نے قدرے غصے سے کہا ''کیک اور چینی کی ضرورت نہیں' میں شوگر کا مریض ہوں''

''بڑی ہی نامراد بیماری ہے شوگر' انسان کو اندر ہی اندر کھوکھلا کر دیتی ہے'' کھڑکی والی اکلوتی سیٹ کے مسافر نے شوگر کے خوش پوش مریض کو دعوتِ مبارزت دی۔

''آپ بھی ڈائی بٹیز ہیں؟'' چینی کے بغیر چائے کا کپ اُس کی جانب بڑھاتے ہوئے خوش پوش مسافر نے اشتیاق سے دریافت کیا۔

''ارے صاحب! ہمارا تو خاندانی مرض ہے یہ' دادا پردادا سے متواتر چلا آ رہا ہے۔''

''میرا معاملہ مختلف ہے۔ میں چار سال قبل ڈائی بٹیز کلب کا ممبر بنا ہوں۔ اِس سے قبل مجھے علم بھی نہ تھا کہ شوگر کس چڑیا کا نام ہے۔''

باری باری دونوں ایک دوسرے کو اپنے تجربات میں شریک کرنے لگے اور رٹے رٹائے پرہیزی نظام الاوقات کو' چبا چبا کر بیان کرنے لگے۔ علاج سے زیادہ دونوں پرہیز کی اہمیت پر زور دے رہے تھے۔ اس کے باوجود انسولین کے محتاج تھے۔ دونوں کو اس موذی مرض کے ردعمل میں بلڈ پریشر' فالج اور دل کے دورے کا خوف دامن گیر تھا۔

وجاہت حسین نے کیتلی میں آنے والی تمام چائے کیک کے دو پیس کے ہمراہ بمعہ ساری شکر نوش کی تو اُنہیں آنکھیں کھلتی محسوس ہوئیں۔ اپنے ہمرائیوں کو باری باری اُچٹتی نظر سے دیکھنے کے بعد پھر سے اپنا ہینڈ بیگ کھولا اور کچھ تلاش کرنے لگے جس کی عدم دستیابی پر گومگو کی کیفیت کے بعد واسکٹ کی دائیں جانب اندرونی جیب میں بایاں ہاتھ ڈال کر چابیاں برآمد کیں اور اٹیچی کھول کر مطلوبہ چیز دستیاب ہوئی تو اُن کے چہرے پر بچگانہ مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ ڈبے میں پہلا سا شور نہ تھا۔ ریل گاڑی وسل بجا کر اگلے اسٹیشن کی آمد کا اعلان کر رہی تھی۔ کچھ مسافر سو چکے تھے کچھ اونگھ رہے تھے کچھ دھیمی آواز میں گپ شپ میں مصروف تھے۔ باقی اخبار یا کتاب پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ وجاہت حسین کے پپوٹے بوجھل ہوئے تو کتاب منہ پر رکھ کر انہوں نے آنکھیں بند کیں اور خیالات میں یکسوئی پیدا کرنے کی کوشش میں مگن ہو گئے۔ ہلکی ہلکی تھکن اور خمار کے باعث خیالات کی رفتار بھی

دھیمی تھی اور اُن کی اُچھل کود میں کمی کے باعث مہہ وسال ٹھہرنا شروع ہو گئے تھے۔

کتنا بھلا سا نام تھا! ''دوہڑلی'' جس میں سرِ شام زندگی تمام ہو جاتی۔ لڑکے بالے چاندنی راتوں میں ''لکن مٹی اور کوت چھلا'' کھیلا کرتے۔ گھروں میں بڑی بوڑھیاں اپنے سوجے ہوئے پنڈوں کی مالش کیا کرتیں یا پوتوں اور نواسوں کو ''جنوں' بھوتوں' پیروں' فقیروں کی کہانیاں سُنا کر بہلاتیں۔ شادی شدہ اور بال بچے دار خواتین شیر خواروں کے کان میں لہسن میں پکا کڑوا تیل ڈالتیں یا اُن کے پیٹوں کی سکائی میں مصروف ہوتیں۔ لڑکیاں' بالیاں کسی گھر کے بڑے آنگن میں اکٹھے ہو کر حسین خوابوں اور کچے جذبوں پر مخول ٹھٹھہ کرتیں۔ کبھی کسی سکھی سہیلی کی شرارت پر اُس کی کمر میں اس زور کا دھپہ مارتیں کہ اُس کی چیخ نکل جاتی جس پر اُس گھر کی بڑی بوڑھی لڑکیوں کو ڈانٹ کر اپنے اپنے گھروں کو بھگا دیتیں۔ گاؤں کے جوان اور شادی شدہ مرد ریڈیو سے کان لگا کر پسند کے فلمی گانے سنتے یا اپنی گھر والیوں کے انتظار میں کروٹیں بدلتے۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے' بزرگ وسیانے چوپال میں اکٹھے ہو کر ایک دوسرے کا دکھ درد بانٹتے۔ اپنی اپنی مشکلات بیان کرتے جہاں گاؤں کا چوہدری اکبر علی' پٹواری دیدار علی' سکول ماسٹر اشفاق حسین کے علاوہ امام مسجد حافظ عبدالمجید تجحر' بردباری اور تجربے کو کام میں لاتے ہوئے بڑے سے بڑا مسئلہ چٹکیوں میں حل کر دیا کرتے۔ ان کے فیصلے کے آگے کسی کو دم مارنے کی جرأت نہ ہوتی۔ یہ بھی حق سچ ہے کبھی کسی کو زیادتی یا ناانصافی کا گلہ ہرگز نہ ہوا۔

وجاہت حسین اور دلاور علی کی دوستی انہی دنوں کا قصہ ہے۔ کبھی کبھی والدین کے ہمراہ' دونوں چوپال کی محفل میں آ جاتے اور دوسری صبح ہم جماعتوں کو اکٹھا کر کے اُسی طرز پر محفل جماتے اور ایک ایک بزرگ کی نقل ایکٹنگ کر کے دوستوں کو دکھاتے۔ مارے ہنسی کے کئی دوستوں کی آنکھوں میں پانی بہنے لگتا اور کئی پیٹ میں بل پڑنے کی شکایت کرتے۔ سب سے زیادہ لطف اور اداکاری کا سکوپ پٹواری دیدار علی کی نقل اتارنے میں تھا۔ گاؤں کا چوہدری اکبر علی نقشین حقے کی لمبی سرخ نَے کو منہ کے ایک سرے میں دباتے ہوئے ہلکا سا کش لے کر' دھکا دور کرتے ہوئے چھاتی سہلاتے اور اُسی دوران ناہموار لفظوں میں دیدار علی سے دریافت فرماتے۔

''کیوں سرکار! آج کِنّے مرغے کوئے نے؟''

دیدار علی ذہنی طور پر' اس حملے کے لئے تیار نہ ہوتا۔ ہڑبڑا کر حواس درست کرتا اور چوہدری صاحب سے یوں گویا ہوتا۔ ''چوہدری صاحب! پھر پھر کے تہاڈی نظر میرے تے پیندی اے۔ جے مخول دا موڈ ہووے تے فجے میراثی نوں سدآ داں۔''

سکول سے واپسی پر لڑکوں کی یہ چوکڑی ملک اقبال کے باغوں کا رخ ضرور کرتی۔ اچھا خاندان اور عمدہ خوراک کے باعث وجاہت حسین کا قد بُت ساتھیوں میں سب سے نکلا ہوا تھا۔ چہرے پر بھی خاندانی شرافت اور بردباری دکھائی دیتی تھی جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وجاہت حسین باغ کے راکھے کے قریب جا کر اُس کی خیر خیریت دریافت کرتا اور اُس کی مدد کا وعدہ کر کے حویلی میں آنے کی دعوت دیتا۔ اِس عرصے میں اُس کے دوسرے ساتھی اپنا کام دکھا جاتے جن میں سب سے ماہر دلاور علی تھا۔ جس کی چستی پھرتی کے باعث' سارے دوست اسے نیولا کہہ کر بلاتے تھے۔ اس کے بعد محبت خان کی بھٹی کھلنڈروں کا مرکز بن جاتی جہاں سے تازہ گڑ یا راب سے چھینا جھپٹی اور دھینگا مشتی کا شغل ہوتا جس کے بعد کرم دین عرف چاچا کرمو کے کولہو پر رک کر کوئی ایک ضرور سوال کرتا!

''چاچا! کس شے دا تیل کڈ دے پئے او۔''

''پتر وے! تسی سارے روز' واری واری میرے کولوں پوچھ دے او کہ میں کس شے دا تیل کڈھنا واں۔ میں روز ای تہانوں دسنا واں' ساڈے پنڈ وِچ سروں توں ہٹ کے کوئی شے ہوندی نئیں۔ ہن تسی دسو' میں کس شے دا تیل کڈھنا واں؟''

سارے لڑکے بالے چاچے کرمو کے جواب پر کھل کھلا کر ہنس پڑتے اور تیل میں انگلیاں ڈبو کر سر پر ملتے ہوئے معشوق علی کے رہٹ پر جا کر' ٹھنڈے اور میٹھے پانی سے پہلے ہاتھ منہ دھوتے پھر باری باری پیاس بجھاتے۔ معشوق علی' سال کے بارہ مہینے سبزیاں اُگاتا تھا۔ گاجر' مولی' شلغم اور ٹماٹر کے دنوں میں لڑکوں کا رُخ معشوق علی کے کھیتوں کی جانب زیادہ ہو جاتا۔ کبھی کبھی لڑکوں کی شرارت حد سے بڑھ جاتی تو ماتھے پر شکن ڈالے بغیر لجاجت سے لڑکوں کو یوں مخاطب کرتا۔

''پترو! جتا تہاڈا دل کرے انھاں کھاؤ' کھان دی شے اے' کھان نال کوئی فرق نئیں پیندا۔ ایں وئیں برباد نہ کرو۔''

وجاہت حسین کے والد زمینداری کے ساتھ ملازمت بھی کرتے تھے۔ اُن کا بہت سا وقت گاؤں سے باہر گزرتا تھا۔ اُن کی غیر موجودگی میں' گھر بار اور زمینوں کی دیکھ بھال دلاور علی کے والد اللہ دتہ کیا کرتے تھے۔ جن کی عمدہ صحت' دیانت داری اور معاملہ فہمی دور دور تک مشہور تھی۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے کہا کرتے تھے ''اچھا ہوا اللہ دتہ جتنا اَن پڑھ رہ گیا اگر یہ دو چار لفظ پڑھ جاتا تو گاؤں کے چوہدری کو نکیل ڈال کر رکھ دیتا۔'' اللہ دتہ کی انہی خوبیوں کے باعث' بڑے شاہ صاحب یعنی وجاہت حسین کے والد اللہ دتہ پر اندھا اعتماد کرتے تھے۔ اس خاص تعلق کے باعث دونوں کی اولادوں میں بھی اُنس پیدا ہو گیا تھا۔ بڑے شاہ صاحب کی بہتر مالی حیثیت کے باعث گاؤں کے ساتھ شہر میں بھی

ٹھیا ٹھکانہ تھا۔ گاؤں کے مڈل سکول سے فارغ ہوتے ہی بڑے شاہ صاحب نے بیٹے کو شہر کے سکول میں داخل کرا دیا جہاں سے وجاہت حسین نے میٹرک' ایف اے اور بی اے کرنے کے بعد ملازمت کا آغاز کیا۔

بڑے شاہ صاحب کی زندگی تک گاؤں سے باقاعدہ تعلق بنا رہا۔ اللہ دتہ اُس کے بیٹے دلاور علی سے بھی مہینے پندرہ دن میں ملاقات کا سبب بن جاتا۔ بڑے شاہ صاحب شہر میں سکونت رکھنے کے باوجود خالص دیہی بود باش کے آدمی تھے۔ جو جنس اُن کی زمینوں پر نہ اُگتی' قیمت دے کر وہ بھی اپنے گاؤں ہی سے منگاتے۔ گڑ' شکر' گھی' گندم' چنا' مکئی حتیٰ کہ معشوق علی کے رہٹ والے پانی کی میٹھی سبزیاں بھی گاؤں سے منگاتے۔ اس طرح اللہ دتہ اور دلاور علی کی شہر آ رجار لگی رہتی۔

گاؤں سے لاتعلقی اور بیگانگی کی ذمہ داری وجاہت حسین پر عائد ہوتی ہے۔ اعلیٰ ملازمت' دیگر شہروں میں تبادلہ' بڑے خاندان میں شادی اور چار بچوں کی پرورش کے جھنجٹ نے گاؤں کی جانب توجہ کی مہلت ہی نہ دی۔ دل ہی دل میں گاؤں کے ماحول کو یاد کرتے اور گاؤں لوٹنے کے منصوبے بھی بنایا کرتے۔ آئے گئے کے ہاتھ دلاور علی اور اُس کے بچوں کے لئے تحفے تحائف اور عید بقر عید پر نقدی کی شکل میں عیدی باقاعدگی سے بھیجا کرتے۔ دلاور علی بچپن کے تعلق کو اُسی گرمجوشی سے نبھا رہا تھا۔ وجاہت حسین نے اپنی زمینیں بٹائی پر دے رکھی تھیں جہاں سے سال کے سال نقدی کے علاوہ فصل کا حصہ بھی باقاعدگی سے آیا کرتا تھا۔ دلاور علی اپنی تھوڑی سی زمین پر اُگنے والی فصلوں میں اپنے بچپن کے دوست وجاہت حسین کو ضرور شریک کرتا۔ ہر فصل پر وجاہت حسین کا حصہ لے کر ضرور پہنچا کرتا۔ جہاں دونوں دوست پوری پوری رات جاگ کر گاؤں کی یادوں کو شیئر کیا کرتے۔ دلاور علی وجاہت حسین کی گاؤں میں دلچسپی دیکھ کر خوشی سے جوان ہو جاتا اور وجاہت حسین کو گاؤں آنے کے لئے مجبور کرتا۔ ہر بار وجاہت حسین' دوست کے اصرار پر وعدہ کرتے اور اُس کے جانے کے بعد مصروفیت میں گم ہو جاتے۔

طویل ملازمت اور ساٹھ سال کی عمر کے دوران انسان کے پاس تجربات کا پہاڑ اور یادوں کا سمندر بن جاتا ہے جبکہ ہم لوگ اُسے ناکارہ جان کر ریٹائرمنٹ کے پروانے کے ساتھ گمنامی اور بے کاری کے صحرا میں دھکیل دیتے ہیں۔ وجاہت حسین کی بیگم کے انتقال کو سات سال بیت چکے تھے۔ اکلوتی بیٹی گھر بار کی ہو چکی تھی۔ پہلے اور دوسرے نمبر کے بیٹے مقابلے کے امتحان میں کامیابی کے بعد دوسرے شہروں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے جبکہ تیسرا بیٹا تعلیم کے لئے ملک سے باہر مقیم تھا۔ نوکر چاکر فارغ اوقات میں وجاہت حسین کی دلجوئی اور اُن سے گپ شپ کی پوری کوشش کیا کرتے۔

ایک دوسرے کے ذہنی اُفق مختلف ہونے کے باعث گفتگو کا سلسلہ زیادہ دُور نہ چل پاتا۔ دوست احباب بھی وجاہت حسین کے خاصی تعداد میں تھے البتہ اُن کی طرح کوئی ریٹائرڈ زندگی نہیں گزار رہا تھا۔

ڈاکٹر مسعود سے وجاہت حسین کی ذہنی ہم آہنگی ہونے کے باعث گاڑھی چھنتی تھی مگر اُن کے پاس گپ شپ کے لئے اضافی وقت نہ تھا کیونکہ اُن کے خیال میں ایک ڈاکٹر کے وقت کے صحیح حقدار اُس کے مریض ہوتے ہیں۔ انصاری صاحب سے بھی وجاہت حسین کے قریبی مراسم تھے۔ مسئلہ انصاری صاحب کا بھی وہی تھا کیونکہ انصاری صاحب شہر کے معروف وکیل تھے۔ شیخ سلیمان سے عمدہ راہ ورسم اور خاصی بے تکلفی تھی ۔ وہ دو اور دو چار سے بہت آگے نکل چکے تھے۔ اٹھتے بیٹھتے کاروبار کی وسعت اور وقت کی قلت کا رونا رویا کرتے ۔ علاقے کے نائی' دھوبی' درزی' قصائی' سبزی و کریانہ فروش وجاہت حسین کی بہت عزت کیا کرتے تھے۔ جب بھی وجاہت حسین کا وہاں سے گزر ہوتا باری باری ہر کوئی آگے بڑھ کر سلام کرتا' خیر خیریت دریافت کرنے کے بعد بیٹھنے کے لئے کرسی ضرور پیش کرتا۔ عوامی جگہوں پر ہر رنگ اور قماش کا آدمی پایا جاتا ہے۔ وجاہت حسین جیسے پڑھے لکھے ریٹائرڈ آفیسر کے لئے زیادہ دیر وہاں ٹھہرنا اور اُن کی گفتگو میں شریک ہونا مناسب نہ تھا۔

گاڑی آہستہ آہستہ جھٹکے کھانے لگی تھی جس کے باعث وجاہت حسین خیالوں کی نگری سے پلٹ آئے۔ دونوں ہاتھوں کی مٹھیوں کی پُشت سے آنکھیں ملتے ہوئے چہار جانب نظر دوڑائی 'خوشی کی گلابی لہر بوڑھے چہرے پر پھیل کر بچوں کی شبیہہ پیدا کرنے لگی۔ چھل پہل اور گہما گہمی کے علاوہ اسٹیشن میں عمارت کی بوسیدگی کے علاوہ کوئی تبدیلی نہ آئی تھی۔ سوائے چند خوردنی اشیاء کے سٹالوں کے۔ وجاہت حسین کی آنکھیں اسٹیشن اور اُس کے اطراف میں سرخ قمیض میں ملبوس قلی کو تلاش کر رہی تھیں اتنے میں ایک لمبے تڑنگے مضبوط جسم کے ساتھ پینسٹھ سال کے بوڑھے نے آگے بڑھ کر کہا۔

''صاب جی! خیر نال کتھوں تشریف لائے نے تے کتھے جانا اے؟

وجاہت حسین کو نو وارد کی بے تکلفی پسند نہ آئی۔ سوالیہ نظروں سے اُس کی جانب دیکھ کر کچھ کہنا ہی چاہتے تھے۔

''مزدور جی! میں مزدور آں' جے تُسی آکھو تے سامان چک لاں .... پیسیاں دی خیر اے جی جو تہاڈا دل کرے دے چھڈناں ....! دل نہ کرے تے بیشک نہ دینا..........!

تانگے کی پچھلی سیٹ کے نیچے اٹیچی اور پائیدان پر بستر بند رکھ کر وجاہت حسین ٹانگیں لمبی

کر کے دراز ہو گئے اور تانگے والے کو چلنے کا اشارہ کر کے دائیں بائیں، اکا دکا پیدل چلنے والوں کو غور اور اشتیاق سے دیکھنے لگے۔ وہ کسی کو نہیں جانتے تھے شائد! کوئی انہیں پہچان کر گرمجوشی سے لپٹ جائے اور گئے وقتوں کو آواز دے لے .... وقت کے گرداب میں ساری شناخت گم ہو چکی تھی۔ کمر کی طرح پتلی اور بل کھاتی سڑک کی شکستگی اور دائیں بائیں سروں پر بالن اٹھائے غریب عورتیں اور کبھی کبھی دھول اڑاتی موٹر سائیکلیں جن میں اکثر کے دونوں جانب دودھ کے ولٹوئے ٹنگے ہوتے۔ کھاد کی فیکٹری سے اٹھتے دھوئیں کے باوجود سب کچھ بدلا بدلا اور غیر مانوس لگ رہا تھا۔ وجاہت حسین آنکھیں موند کر خیالوں کا سلسلہ جوڑنا چاہتے تھے۔ سڑک کی ناہمواری کے باعث تانگے کی اچھل کود اور اس کے دونوں پہیوں سے چوں چراں کی آوازیں ذہن کو ایک نقطے پر مرکوز ہونے نہیں دے رہی تھیں۔ وجاہت حسین نے تانگے والے سے دلاور کے گھر چلنے کا کہا تو وہ اجنبی نظروں سے وجاہت حسین کی جانب دیکھنے لگا۔

''کمال ہے میاں! تم دلاور علی کو نہیں جانتے وہ تو موضع دوہڑلی کا مشہور آدمی ہے .... چلو تم ایسا کرو مجھے گاؤں کی چوپال پر پہنچا دو وہاں سے میں خود تمہیں دلاور علی کے گھر کا راستہ بتا دوں گا''

''کہاں کے رہنے والے ہیں بابو جی ....؟ دوہڑلی کسی کام سے آئے ہیں ....؟''

''میاں! کیا کرو گے جان کر .... بس تم ہمیں گاؤں کی چوپال تک پہنچا دو تمہاری بڑی مہربانی ہو گی''

''سرکار! آپ کس چوپال کی بات کر رہے ہیں مجھے تو کچھ پتہ نہیں .... میں آپ کو چودھری کی ہٹی پر لئے چلتا ہوں۔ وہ گاؤں کے چپے چپے سے واقف ہے۔ آپ اُسی سے سب کچھ معلوم کر لینا!''

جھٹپٹے کے باوجود وجاہت حسین نے تانگے والے کی رائے سے اتفاق نہ کیا۔ یادداشت پر زور دیتے ہوئے تانگے والے کی رہنمائی شروع کر دی۔ تھوڑی دیر کے دائیں بائیں کے بعد وجاہت حسین کی مطلوبہ جگہ آ گئی۔ جہاں چوپال کے بجائے یونین کونسل کے دفتر کا بورڈ آویزاں تھا۔ وجاہت حسین کے ذہن میں معشوق علی کے رہٹ کی یاد کا لشکارہ چمکا اور وہ تانگے میں رکھے سامان سے بے نیاز ہو کر اُس جانب قدم بڑھانے لگے۔ وہاں پہنچ کر بھی وجاہت حسین کو مایوسی کا سامنا ہوا۔ معشوق علی کے پرانے رہٹ کی جگہ جدید ٹیوب ویل نصب ہو چکا تھا اور وہاں کوئی آدمی دستیاب نہ تھا جس سے معشوق علی اور اُس کے رہٹ کی بابت دریافت کیا جا سکتا۔ اُمید کی آخری کرن کرم دین عرف چاچا کرمو کا کولہو تھا جس کی جگہ کئی دکانیں تعمیر ہو چکی تھیں جن میں ایک حلوائی دوسرا نائی تیسرا پرچون فروش اور چوتھی ترکھان یا منجی پیڑھی والے کی لگتی تھی۔ وجاہت حسین نے چند قدم کا فاصلہ طے

کر کے ٹانگے والے کو بلایا اور اُس کے ہمراہ پیدل چلتے ہوئے دکانوں تک آ گئے۔

''اللہ تہاڈا بھلا کرے..........میں بھی تہانوں ایتھے ای لے آریا ساں..........!''

وجاہت حسین نے خشمگیں سے ٹانگے والے کی طرف دیکھتے ہوئے کرایہ دریافت کیا تو اُس نے ہاتھ کے اشارے سے منع کرتے ہوئے کہا۔

''رہن دیو باؤ جی..........تسی مہمان لگدے او..........مہماناں کولوں کیہ کرایہ لینا..........!

''نہیں بھئی شرع میں کیسی شرم..........!''

وجاہت حسین نے دس دس کے تین نوٹ ٹانگے والے کے سلوکے کی جیب میں ٹھونستے ہوئے سامان اُتارا اور ٹانگے والے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کریانے والے کی طرف بڑھے۔

''اسلام علیکم..........!''

''وعلیکم اسلام..........بسم اللہ جی..........فرماؤ کیہہ خدمت کراں..........؟''

''بھائی! مجھے دلاور علی ولد اللہ دتہ کے گھر جانا ہے..........!''

''ہیں جی..........! (غور سے دیکھتے ہوئے) آ..........آپ..........میرا مطلب ہے..........آپ..........چھوٹے شاہ صاحب وجاہت حسین تو نہیں..........؟''

''آپ کا اندازہ درست ہے بھائی..........میں وجاہت حسین ہی ہوں..........مگر..........میں نے آپ کو پہچانا نہیں..........؟''

''ارے میرے بادشاہ..........! (دکان کے اندر سے' کمر پر ہاتھ رکھ کر ہائے کرتے ہوئے باہر آ کر) آپ مجھے کیا پہچانیں گے..........مجھے تو خود اپنی شکل بھول گئی ہے..........!''

''تم..........تم..........جمیل ہونا..........چودھریوں کے پُتر..........؟''

''بھائی وجاہت..........! کس زمانے کی بات کر رہے ہو..........اب تو میں چودھری ہٹی والا ہوں..........باقی کچھ بھی نہیں بچا..........کچھ بھی نہیں بچا..........آؤ..........آؤ تمہیں تمہاری بھرجائی اور بچوں سے ملواتا ہوں..........''

''جمیل بھائی! پہلے مجھے میرے یار دلاور علی سے ملا دو پھر جہاں آپ کہو گے وہیں چلوں گا..........بھرجائی سے بھی ملوں گا اور بچوں سے بھی..........میں تو گاؤں کے ایک ایک فرد سے ملنے کی آرزو لے کر آیا ہوں..........''

نہ صرف گلی بلکہ دلاور علی کے گھر کا نقشہ بھی یکسر تبدیل ہو چکا تھا۔ گردو پیش کے میدان میں بہت سے کچے پکے کوٹھے تعمیر ہو چکے تھے جن میں بجلی کے قمقموں کی روشنی جھلمل کر رہی تھی۔

وجاہت حسین نے دروازے پر دستک دینے کے لئے پورا پنجہ آگے بڑھایا تو وہاں گھنٹی کا بٹن وجاہت حسین کا منہ چڑا رہا تھا۔ دلاور علی کے دو گبھرو جوان بیٹوں نے پہلی نظر میں شہر والے چچا کو پہچان لیا۔ احترام سے جھک کر دونوں نے وجاہت حسین کے گھٹنوں کو ہاتھ لگائے اور بڑی حیرت سے اُن کی آمد کا سبب دریافت کیا؟

''کم عقلو! ساریاں گلاں کھڑے کھلوتے ہی کرو گے..........؟''

چودھری جمیل کی تنبیہ پر دونوں لڑکے خجالت سے معافی مانگتے ہوئے چاچوں کا ہاتھ پکڑ کر پہلے دیوڑھی پھر بیٹھک میں لے گئے۔ ایک نے کرسی صاف کرتے ہوئے وجاہت حسین کی طرف بڑھائی اور دوسرا لسی پانی کے بندوبست کے لئے اندر لپکا۔

''نہیں بھئی اِسے تو تم دور ہی رکھو۔ سارا قصور کرسی کا ہے وگرنہ اپنی دھرتی' اپنی مٹی سے کون اتنا عرصہ دور رہ سکتا ہے..........! بھئی اپنے باپ کو تو بلاؤ مدت سے اُس کی شکل کو ترسا ہوا ہوں..........!''

''ہیں جی..........؟''

اتنے میں دوسرا بھائی' ٹرے میں چائے کی ماڈرن کیتلی اور نئے ڈیزائن کے کپوں کے ساتھ بسکٹ لے کر داخل ہوا' ایک کپ وجاہت حسین دوسرا چودھری جمیل کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''اور سنائیں چاچا جی! شہر میں تو سب خیریت ہے..........؟''

''بھائی! چاچا جی ابا کا معلوم کر رہے ہیں..........؟

''ہیں..........ابا کا معلوم کر رہے ہیں..........پر ابا تو..........؟''

چودھری جمیل اور وجاہت حسین نے بیک زبان دونوں لڑکوں کو زیادہ فکرمند ہوتے ہوئے دلاور علی کی بابت جاننا چاہا جسے سن کر وجاہت حسین کے چہرے پر ہوائیاں اڑ گئیں..........آج سے قبل' انسان کا کرچی کرچی ہونا صرف سنا تھا اس وقت جو کچھ وجاہت حسین پر بیت رہی تھی اُس سے اُن کا دل اور دماغ اپنی معاشرت اور روایت کی تباہی کے ماتم کے سوا کچھ نہ کر سکتے تھے..........وجاہت حسین نے اپنی آنکھوں میں اُمڈتے آنسوؤں کو کچھ دیر کے لئے ضبط کرتے ہوئے دونوں گبھرو جوانوں کے سروں پر ہاتھ پھیر کر دعائیں دیں اور واپسی کے لئے پلٹ پڑے..........نوجوانوں کا صرار' بچپن کے دوست کی منت سماجت' آبائی مٹی کی کشش' وسیع وعریض حویلی' لہلہاتے کھیت اور ملک اقبال کے باغات بھی وجاہت حسین کو ایک لمحے کو ستانے کے لئے مجبور نہ کر سکے..........وہ ہر قیمت پر جتنی جلد ممکن تھا شہر پہنچنا چاہتے تھے..........جہاں اُن کے بچپن کے دوست اور غمگسار دلاور علی پر اُن کے انتظار میں نجانے کیا بیت رہی ہو گی..........؟؟؟

مسائلِ تصوّف

''جنٹلمین.........! آپ لوگ' بہتر طور پر جانتے ہیں کہ آج! اتنی بڑی تعداد میں' ہمارا یہاں جمع ہونا' مقدس مشن کی تکمیل اور اُس کی منصوبہ بندی کو آخری شکل دینے کے لئے ہے......... آپ کے علم میں ہے کہ ہم نے اور ہمارے آباء نے اپنی بقا اور سلامتی کی جنگ' بڑے تحمل' صبر' بردباری' مہارت اور دانشمندی سے لڑی ہے......... ہم نے ہمیشہ ذاتی مفاد کو قومی مفاد پر قربان کیا ہے......... بارہا! ظالم' جابر' سفاک اور بھیڑیئے تک کے لقب سے ہمیں نوازا گیا مگر ہم نے! جہالت اور کم علمی سے منسوب ان القابات پر جذبات کی بجائے عقل وشعور کو غالب رکھا......... بہت سے عاقبت نااندیش' بزدل اور کم ہمت ''تجارت سے توپ'' کی حکمتِ عملی کو تنقید کا نشانہ بنا کر' ہماری انسان دوستی کو مشکوک کرنے کی کوشش کرتے رہے.........! کیا وہ نہیں جانتے؟ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے.........! جنگ بھی وہ جو نسل در نسل اور صدیوں پر محیط ہے.........! ہم پر' ناواجب تنقید کرنے والے اور ہماری دُور اندیشی کو انسانیت کے لئے مضر گرداننے والے' اِس بات کا جواب دے سکتے ہیں؟ اگر ہماری جانب سے ذرا بھی سستی' غفلت یا لاپرواہی کا مظاہرہ ہوتا تو کیا آج! ہم اُن کی اور وہ ہماری پوزیشن پر نہ ہوتے.........؟ ہم نے اپنی تعلیمات کی پیروی میں' انسانیت کی فلاح کے لئے جتنے منصوبے' وسائل اور توانائی اپنے دشمن پر صَرف کی ہے اُس کا ہم پر تنقید کرنے والوں کے ہاں تصور بھی نہیں پایا جاتا.........! اپنی رگوں سے خون نچوڑنے کا الزام لگانے والے' وقت پڑنے پر اپنوں کا گوشت بلکہ ہڈیاں تک چبانے سے دریغ نہیں کرتے.........!

ہماری تقلید' ہماری زبان' ہماری ثقافت سے روشن دماغی کا لیبل چُرانے والے' نام نہاد دانشور' سیاستدان' بیوروکریٹ' اساتذہ اور ٹیکنوکریٹ کبھی ٹھنڈے دل سے غور کیوں نہیں کرتے کہ اُنھیں ہم سے گِلہ کس چیز کا ہے.........؟ کون سی عنایت' کون سی مہربانی اور کون سی نعمت ہے جس سے ہم نے انھیں نہیں نوازا.........! بیل گاڑی کے سست رفتار سفر سے جہاز کی برق رفتاری کس کی مرہُونِ منت ہے.........؟ مٹی کی ہانڈی کو مائیکروویو اوون میں کس نے تبدیل کیا.........؟ سرکنڈے کے قلم سے' کمپیوٹر تک ترقی کا سفر کس کے خونِ جگر کا ثمر ہے.........؟ کس کے طفیل چیچک' ہیضہ' پلیگ اور ٹی بی جیسی بے ضرر بیماریوں سے' کیڑے مکوڑوں کی طرح' مرنے والے' بلڈ پریشر' شوگر' ہارٹ اٹیک اور ایڈز جیسی مہلک بیماریوں سے سروائیو کر رہے ہیں.........؟ وہ یہ کیوں فراموش کرتے ہیں کہ آزاد قوموں میں اُن کا شمار......... ہماری دریا دلی کی دین ہے.........! ہم چاہتے تو چوہوں کے بِلوں کو غلام رکھنا ہمارے لئے قطعی مشکل نہ تھا......... ہم! اُن پر ثابت کرنا چاہتے تھے کہ تم لوگ جن کو مسیحا جان کر ہم سے چھٹکارا حاصل کر رہے ہو وہ نہ صرف تمہارے دشمن' جھوٹے' مکار' فریبی اور مجمع باز ہیں بلکہ دلی اور دماغی طور پر بھی قطعی بونے ہیں.........! اُن کے دلوں اور دماغوں پر' ہماری نقالی کا بھوت سوار ہے......... وہ ہر قیمت پر اقتدار حاصل کر کے ظلِ سبحانی اور عالم پناہ بن کر اپنی حیثیت' مرتبہ اور مال و دولت میں اضافہ چاہتے ہیں......... بیشک! اُن کو غلام بنا کر حکمرانی کرنے میں ہمارا بھی مفاد پوشیدہ تھا مگر انفرادی نہیں اجتماعی' عارضی نہیں دائمی' بے مقصد نہیں مقصدی......... اُن کے دیسی حکمرانوں کا تمام تر زور ذاتی مفاد اور عیاشی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ جس کا ثبوت اُن کے ہاں تیزی سے بڑھتی ہوئی مہنگائی' بے روزگاری' بدامنی' رشوت اور طرح طرح کے جرائم ہیں جس میں انسان تو کیا ایمان بھی بِک رہے ہیں.........!

ایک الزام ہم پر دخل اندازی اور معاشی جکڑ بندی کا لگایا جاتا ہے.........! آپ کو اجازت ہے چاہیں تو اس نانسنس اپروچ پر دل کھول کر ہنس سکتے ہیں.........! ہنسنے کے بعد اس امر پر غور ضرور کیجئے کہ احمقانہ الزام میں حقیقت کا شائبہ کس قدر ہے.........! کبھی دنیا میں وہ چیز بھی خریدی گئی ہے جو برائے فروخت نہ ہو.........؟ ہم اپنی محنت' لگن اور عزم سے طاقت حاصل کر کے پوری دنیا کو ماچس کی ڈبی میں بند کر سکتے ہیں تو ہمیں کیا غرض تھی ان نام نہاد بونوں کو خریدتے اور ان کی قوموں کا حکمراں بناتے.........؟ دیکھئے آپ لوگ پھر ہنس رہے ہیں حالانکہ مقام غور و فکر کا ہے.........! یہ لوگ ہماری دہلیز پر اقتدار کے ساتھ اُس کے بعد کے لوازمات کے لئے بھی اِس رِقت اور عاجزی سے جبیں رگڑتے ہیں کہ ہم جیسے عمل پسند لوگ بھی سہل پسندی کا شکار

ہوکران کوآلۂ کار بنانے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور نتائج خود بخود ہماری جھولی میں آن گرتے ہیں۔
مجھے احساس ہے، میں شرمندہ بھی ہوں.........! عمل پسند قوم کا نمائندہ ہونے کے باوجود کسی کسی لمحے، جذبات مجھ پر غالب آتے رہے.........! مجھے معاف فرمایئے اور باقاعدہ طور پر کام کا آغاز کیجئے.........! آپ لوگوں نے تمام تحریری مواد کا بغور مطالعہ فرمایا، کیمرے اور تیکنیک کی مدد سے پردہ سیمیں پر عکسی مناظر ملاحظہ فرمائے ازاں بعد گروپس کی شکل میں مباحثوں میں حصّہ لیا۔ جن کی رپورٹس ہماری میزوں پر دستیاب ہے۔ اُسی کی روشنی میں ہمارے ماہرین آپ کے تمام سوالات، خدشات اور اندیشوں کے تسلی بخش جوابات دیں گے اور آپ کی تجاویز و آراء کو خوش آمدید کہیں گے.........! طریقۂ کار اِس طرح ہے کہ آج کے اِس اجتماع کا نہ کوئی صدر ہے، نہ چیئر مین ہم سب برابری کی بنیاد پر ایک دوسرے کا احترام کرتے ہوئے پروگرام کی حتمی منظوری تک شریک گفتگو رہیں گے.........! تمام نشستوں کے سامنے برقی بلب لگا ہوا ہے۔ جس کا بٹن آپ کے ہاتھ کی دسترس میں ہے اُسے دبا کر آپ اپنا بلب روشن کر دیں گے۔ جس کے بعد آپ کو باقاعدہ گفتگو کی دعوت دی جائے گی.........! ایک کے بعد ایک کے اصول پر یہ سلسلہ کُلّی اتفاق تک جاری رہے گا.........! کام کے باقاعدہ آغاز سے قبل، ایک معذرت! سوری آئی ایم ایکسٹریملی ویری سوری، پہلی معذرت میری ذات کی نسبت سے تھی جب کہ دوسری معذرت اجتماعی ہے.........! آپ کی تواضع کے لئے تمام تر تکلفات کے باوجود ''مشروبِ مسرور'' سے قطعی طور پر پرہیز کیا گیا ہے.........! ہم تاریخ کے سب سے نازک دور سے گزر رہے ہیں۔ جس کے ایک ایک لمحے کے لئے ہم سب کو اپنے نامور اور محترم بزرگوں کی ارواح کے علاوہ مستقبل کے مورّخ کے روبرو جواب دہ ہونا ہے لہٰذا اپنی بقا کی جنگ کے اہم فیصلوں میں کسی بھی طور پر اپنی ذات کو مدہوشی کے الزام سے محفوظ رکھنا ہم سب کا فرض ہے.........! مجھے اُمید ہے آپ کا تعاون اور قربانی آنے والی نسلوں کے لئے سنگِ میل ثابت ہوگا!!''

''جی محترم.........! آپ کو خوش آمدید کہتے ہوئے میں اپنی خوشی بیان نہیں کر سکتا.........! کیسا حُسنِ اتفاق ہے؟ حق بحق دار رسید کے مطابق آپ کی ٹیبل کا بلب سب سے پہلے روشن ہوا یہ نہ صرف ہم سب کے لئے نیک شگون بلکہ خوش قسمتی اور برکت کا باعث ہے.........!''

''آپ کے بلکہ ہم سب کے مرتب کردہ پروگرام کی کامیابی یا خدانخواستہ ناکامی کی بابت دوستوں کے ذہن میں بہت سے سوالات ہوں گے.........! میرے ذہن میں بھی کچھ تحفظات ہیں جن کا ذکر میں بعد میں کرنا چاہوں گا.........! سب سے پہلے جس سوال نے مجھے مضطرب کیا ہے وہ

یہ ہے کہ ہم لوگ آج کے اس اکٹھ کی بابت' میڈیا کو کس طرح جسٹی فائی کریں گے اور آج کے اجلاس کو کیا عنوان دیں گے.........؟''

''سوال یقیناً اہم ہے اگر آپ کے علاوہ کوئی اور محترم دوست اٹھاتے تب.........؟ حضور والا! ہمارا میڈیا ہم سے الگ نہیں ہے۔ جس طرح ماضی میں ہمارے میڈیا نے' ہماری کامیابی اور کامرانی میں بھرپور کردار ادا کیا ہے اسی طرح وہ اس مہم اور منصوبہ بندی میں بھی ہر طرح سے ہمارے شریک ہیں.........! آپ بخوبی جانتے ہیں ہمیں ہزاروں یا لاکھوں میڈیا منیجروں کی قطعاً پروا نہیں ہے۔ ہاتھوں کی انگلیوں پر گِنے جانے والے نشر و اشاعت کے چند بڑے ادارے عین اِسی طرح اپنی برادری کے رہبر و رہنما ہیں جس طرح ہم اور آپ کرّہ ارض کی قسمت کے مالک.........! کون سی بات خبر ہے یا کس بات کو خبر بنانا ہے اس کا فیصلہ کرنے میں وہ لوگ پوری ذمہ داری کو ملحوظ رکھتے ہیں.........! مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی توقف نہیں کرنا چاہئے کہ ہمارے میڈیائی دوستوں نے تمام وسائل اپنی ذات کے بجائے مقدّس نصب العین کے لئے وقف کیے ہوئے ہیں۔ ہماری کامیابی میں اُن کی کاوشوں اور قربانیوں کا بیان مشکل ہے.........! آپ کو' ہم سب کو بہت سے اہم واقعات اچھی طرح یاد ہونا چاہئے جب ان لوگوں نے بڑی سے بڑی خبر کو' غیر اہم بنا کر میڈیا تک پھٹکنے بھی نہیں دیا اور کبھی کبھی رائی کا پہاڑ بنا کر آسمان سر پر اٹھا لیا.........! زیادہ عرصہ نہیں گزرا' ہم سب کو سرکش خاتون کا انجام اور اُس کا دُھند میں غائب ہونا اچھی طرح یاد ہونا چاہئے جس نے بچگانہ حرکتوں سے ہمارے وقار کو بٹہ لگانے کی کوشش کی تھی.........!''

''جی بندہ پرور ارشاد.........! نا' نا آپ کو زحمت کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں' اطمینان سے نشست پر تشریف رکھتے ہوئے اپنا نقطۂ نظر بیان کیجئے.........!''

''میرے لئے یہ امر حیرانی کا باعث ہے کہ تمام محترم دوستوں نے اس منصوبے پر غور فرماتے ہوئے اتنے بڑے جانی اور مالی نقصان سے کس طرح صرفِ نظر کر لیا.........؟ میں نہیں سمجھتا کہ آپ اکیلے یا ہم سب مل کر اتنے خوفناک جانی و مالی نقصان کو برداشت کر سکیں گے.........؟ میری درخواست ہے کہ ہم سب کو تحمل مزاجی سے' اس ایک نکتہ پر غور و فکر کرنا چاہئے اور بار بار کرنا چاہئے.........!''

''آپ کا فرمان بجا اور صائب ہے.........! ہمیں ایک ایک شِق اور ایک ایک نکتہ پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کر کے عمل کی جانب قدم بڑھانا چاہئے.........! جہاں تک آپ کے سوال کا تعلق ہے واقعی ـــــــ نقصان کی مالیت اور تلف ہونے والی جانوں کی تعداد کافی

زیادہ ہے مگر اُس سے کم ہے جتنی کاغذ پر نظر آ رہی ہے.........! سب سے پہلے میں انسانی جانوں کی بابت عرض کروں گا کیوں کہ انسان سے مقدس اِس سرزمین پر کوئی شے نہیں.........! اِس باب میں ہماری حکمتِ عملی یہ ہے کہ ہم' زیادہ سے زیادہ بلکہ قریب قریب اپنے تمام کارکنان کو' اُس دن کام سے غیر حاضر رہنے کی ہدایت کر دیں گے۔ اِس طرح ہمارا جانی نقصان نہ ہونے کے برابر رہ جائے گا.........! باقی جتنا بھی جانی نقصان ہو چونکہ وہ ہمارا نہیں ہو گا لہٰذا ہمیں اُس سے کیا سروکار.........! ہمارے میڈیا نے طے شدہ حکمتِ عملی کے تحت اِس واقعے کو اپنے انداز میں پروجیکٹ کرنا ہے (معاف کیجئے میں ابھی واقعہ ہی کہوں گا) لہٰذا مرنے والوں کی تعداد وغیرہ بڑا مسئلہ نہیں.........!''

''مجھے آپ کے استدلال سے اتفاق نہیں ہے.........! اِس ہدایت کو خفیہ رکھنا قطعی ناممکن ہے.........! بات دو چار' دس بیس' سو پچاس تک محدود نہیں ہزاروں کا معاملہ ہے.........؟''

''آپ کا کیا خیال ہے.........؟ ہم تیسری دنیا کے ممالک کی طرح تحریری ایڈوائز اور ہینڈ آؤٹ کے ذریعے اتنی اہم اور خفیہ ہدایت جاری کریں گے.........؟ نہیں صاحب ہرگز نہیں اس طرح جاری ہونے والی ایڈوائز اور ہینڈ آؤٹ وقت سے پہلے طشت از بام ہو جایا کرتے ہیں۔ اس بار ہم نے یہ مہم ''سینہ گزٹ'' کے ذریعے نشر کرنے کا پروگرام بنایا ہے.........! سینہ گزٹ سے مراد آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ ایک شخص دوسرے کو زبانی اور خفیہ ہدایت کے ذریعے اس دن کام پر آنے سے متنبہ کرے گا.........؟ ہماری رازداری اور برداشت تو پوری دنیا میں مثال کے طور پر استعمال ہوتی ہے.........!''

''سوال کا دوسرا حصہ.........! مالی نقصان کی بابت ابھی تک تشنہ طلب ہے اگر ایک بار ہم لوگ مالی طور پر عدم توازن کا شکار ہو گئے تو ہمارے دشمن کو ہمیں زیر کرنا مشکل نہ ہو گا.........! اتنے بڑے پیمانے پر فضائی کمپنیوں کا خسارہ اور اُس کے ردعمل میں انشورنس کمپنیوں پر مالی بوجھ' بینکنگ کے شعبہ کو ڈھا نہیں تو ڈانواں ڈول ضرور کر دے گا.........؟''

''میں آپ کی تشویش میں برابر کا شریک ہوں.........! واقعی معاملہ بہت حساس اور سنگین ہے۔ ہمارا ماضی اس طرح کے خطرات سے گزر کر ہی اس مقام پر پہنچا ہے لہٰذا ہمیں بھی اپنی کامیابی کا پورا یقین ہے.........! آپ نے غور فرمایا ہو گا کہ کسی تاریخی عمارت' جگہ یا کسی چیز کی تباہی کے بعد ہمارے عوام کا تجسس اور اشتیاق انتہاؤں کو پہنچ جاتا ہے.........! بھاری سے بھاری قیمت

دے کر بھی ہم لوگ اُس یادگار کو محفوظ کرنے کے جنون میں مبتلا ہو جاتے ہیں.........!''

''آپ کی بیان کردہ طویل تمہید کے باوجود' شرکائے محفل یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں.........؟''

''جنابِ والا.........! میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے پاس ابھی سے تباشدہ بلڈنگ کا میٹریل خریدنے کی پیشکش آنا شروع ہوگئی ہیں جو کسی طرح بھی بلڈنگ کی مالیت سے کم نہیں ہیں.........!''

''خوب ....بہت خوب.........! کیا کہنے.........! بڑی یونیک پلاننگ ہے.........! مگر ہوائی کمپنیوں اور مالیاتی اداروں کی بابت بھی کچھ روشنی ڈالئے نا.........؟''

''میں آپ تمام حضرات کی سنجیدہ توجہ کا طالب ہوں.........! صفحہ نمبر تین سو چوالیس پر پیراگراف اے۔ بی آپ کی توجہ کا طالب ہے.........! ہم لوگ جتنے مہذب' اصول پرست اور قوانین کے پابند ہیں اتنے ہی کمزور دل بھی واقع ہوئے ہیں.........! دنیا کا ہر مہذب اور پڑھا لکھا آدمی کسی قدر کمزور اور بزدل بھی ہوا کرتا ہے.........! اس سلسلے میں بھی ہمارے میڈیا کا اہم کردار ہے.........! متذکرہ بالا صفحے پر بیان کردہ بیماری کا ہوّا کھڑا کر کے ہمارا میڈیا خوف و ہراس کی ایک فضا قائم کر دے گا.........! آپ تو جانتے ہیں ہماری عوام کسی بھی طرح کا ناواجب ٹیکس دینے پر کبھی آمادہ نہیں ہوتی مگر میڈیا کے زیر اثر پھیلائے ہوئے خوف کے ردعمل میں مذکورہ بالا بیماری کے سدِ باب کے لئے منہ مانگی قیمت پر اُس کے بچاؤ کی تدابیر ہر حال میں کرے گی.......لہٰذا......! مالیاتی اداروں نے ایک کنسورشیم بنا کر تمام دوائی کمپنیوں کو اُس مہلک بیماری سے بچاؤ کی دوائی کے بڑے پیمانے پر آرڈر دے کر نہ صرف گودام بھر لئے ہیں بلکہ تمام ادویہ ساز اداروں کو اس امر کا پابند کر لیا ہے کہ وہ یہ خاص دوائی صرف مذکورہ مالیاتی اداروں کی ہدایت پر تیار کریں گے اور جس کی مارکیٹنگ سے نہ صرف مالیاتی ادارے اپنا خسارہ پورا کریں گے بلکہ بھاری منافع بھی کمائیں گے.........؟''

''مسٹر.........؟ ہمیں آپ کی سالہا سال کی ریسرچ' منصوبہ بندی اور قوت ارادی پر پختہ اعتماد ہے.........؟ آپ یقین سے کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ اتنے بڑے پیمانے پر' ماہر و مشاق اور خودکُش رضاکار' اُنھیں مہیا ہو جائیں گے اور وہ سب کے سب' آپ کی خواہش کے مطابق تمام اہداف حاصل کر لیں گے.........؟ کیا ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ یہ تمام کارروائی فرضی طور پر اُن کے کھاتے میں ڈالی جائے گی.........؟

''جناب والا.........! مَیں خود پر قابو رکھتے ہوئے بہت احترام کے ساتھ عرض کروں گا

بلکہ آپ سے دریافت کرنا چاہوں گا.........! ہمارے' آپ کے یا کسی بھی محترم شرکاء کے یہاں' اس قدر جاہل اور عقل کے اندھے دستیاب ہیں.........؟ ہرگز نہیں.........! جدید علم کی روشنی سے مالا مال کر کے اپنے نوجوانوں کے جذبات پر' ہم نے عقل کا غلاف چڑھا دیا ہے.........! اندھے کنوئیں تو کجا' عام سادہ گڑھے میں چھلانگ لگانے سے پہلے' ہمارے نوجوان اپنا اور اپنی قوم کے نفع نقصان پر سو بار نہیں' ہزار بار غور کرتے ہیں.........؟''

''بہتر نہ ہوگا کہ آپ تبلیغ کا شوق پورا کرنے کی بجائے اصل منصوبے پر تفصیل سے روشنی ڈالیں.........!''

''آپ بخوبی جانتے ہیں.........! ہم نے نہایت محنت اور جانفشانی سے' اپنی اُمیدوں کی فصل' اندھے عقیدے کی سرزمین پر بوئی ہے.........! اُن کی اُمیدوں' آرزوؤں اور تمناؤں کا تناور درخت' ہمارے ہی ہاتھوں کاشت ہوا اور ہماری پائپ لائن کی زرخیزی سے پھل پھول کر مزید چھوٹے بڑے درختوں کی آبیاری کر رہا ہے.........! بظاہر وہ اُن کے لئے' چھتر چھاں کیے ہوئے ہے مگر اُس کی جڑوں میں ہماری سپلائی کردہ خوراک' عنقریب اُن کے لئے خوفناک شعلوں کی بارش برسانے والی ہے.........!''

''اُن لوگوں کے بار بار ذکر سے آپ پر بھی اُنھیں کی مانند جذباتی کیفیت طاری ہو رہی ہے.........! سوال یہ ہے کہ آپ کس اُمید' وثوق اور یقین کے ساتھ منصوبے کی کامیابی پر زور دے رہے ہیں.........!''

کبھی کبھی منزل تک پہنچنے کے لئے' ٹیڑھی راہ کا انتخاب بھی ضروری ہوتا ہے.........! میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہم نے اُن کی آرزوؤں اور عقیدت کے مرکز کو پہلے پالا' پوسا اور طاقتور بنایا پھر اُس کے کاروبار کو وسعت دے کر دولت کے ڈھیر پر کھڑا کر دیا اور سب سے آخر میں اُس کے ذہن میں طاقت کا زہریلا نشہ بھر کے اپنی دشمنی کا لاوا بھڑکا دیا.........! وہ جب جب جہاں جہاں اپنی خود ساختہ طاقت' سرمائے اور ذہانت کے برتے پر جتنے منصوبے بھی بنائے گا در پردہ ہماری معاونت اور مہارت اُن میں شامل رہے گی.........! ہمیں علم ہے کہاں کہاں کتنی تعداد میں' ہماری آستینوں میں سانپ پل رہے ہیں.........! ہمارے مشاق کارندے قدم قدم پر اُنھیں اپنی مرضی کا دودھ پلا کر اور اپنے مطلب کے گُر سکھا کر اُن کے نام نہاد مقاصد کی جانب دھکیلتے جائیں گے.........! بظاہر وہ اپنے مقدس مشن کی جانب گامزن ہوں گے مگر تکمیل ہمارے مقاصد کی کر رہے ہوں گے.........!

''یعنی آپ ....؟ خودکُش رضاکاروں کی تربیت اور پلاننگ میں درپردہ طور پر معاونت کررہے ہیں.........؟ یہ تو بہت خطرناک کھیل ہے.........! کرّۂ ارض کی تاریخ میں کسی قوم نے اتنی بھاری قیمت دے کر شاید ہی اپنے مقاصد حاصل کیے ہوں..........؟ سوچیے.........! غور کیجئے.........! ذرا سی غفلت اور لاپرواہی' آسمان سے دھکیل کر ہمیں کھجور میں نہ اٹکادے.........؟''

''بہت کچھ حاصل کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ تو قربان کرنا ہی پڑتا ہے.........! آپ اطمینان کے ساتھ ہمیشہ کی مانند حوصلے جواں رکھئے' خدا ہمارے ساتھ ہے.........!''

''آپ نے اس امر پر غور کیا ہے.........! تھوڑے سے وقت میں اُن لوگوں کی کتنی بڑی تعداد ہم خیال و یکجا ہوگئی ہے.........! میرے خیال میں آپ کے اِس عمل کے بعد اُن کی صفوں میں نفرت کی نہ ختم ہونے والی لہر' آپ کے اور آپ کی مسلح افواج کے خلاف بھڑک اٹھے گی جس سے بڑے پیمانے پر احتجاج اور بغاوت یقینی ہے.........!''

''بلاشبہ.........! آپ نے انتہائی اہم نکتہ کی جانب توجہ دلائی ہے' آپ سب کی روشن آنکھیں اور تابدار چہرے اس اہم سوال میں آپ کی دلچسپی کو عیاں کررہے ہیں مگر اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لئے بھی ہمیں ماضی کی جانب تھوڑا سا سفر پھر سے کرنا ہوگا.........! زیادہ پرانی بات نہیں صرف ڈیڑھ دہائی قبل تک سفید ریچھ نے ہمارا ناطقہ ہر شعبہ زندگی میں بند کیا ہوا تھا.........! ایک دو نہیں مسلسل سات دہائیوں تک اُس نے ہماری برابری اور ہم عصری کی اندھی دوڑ دوڑ کر' دنیا کے ایک معقول حصّے کو اپنی طاقت سے مرعوب کرلیا تھا۔ آپ کو یاد ہے.........؟ کتنی بڑی تعداد میں لوگ اُس کے نعروں کی گھن گرج کے سحر میں گرفتار ہو گئے تھے.........! ہم بھی' دنیا دکھاوے کو قدم سے قدم ملا کر اُس کے ساتھ دوڑتے رہے مگر اُس کے فرشتوں کو بھی یہ بھنک نہ لگنے دی کہ جس ٹریک پر وہ ہمارے ساتھ دوڑ رہا تھا اُسی ٹریک کے نیچے ہمارے بچھائے گئے جالوں کی سرنگ اُس سے بھی تیزی سے کھودی جارہی تھی۔ جو ایک دن اُن کے اقتدارِ اعلیٰ پر جا کر اس شکل میں نمودار ہوئی کہ اُن کا وجود کرچی کرچی ہوگیا.........!''

''کیا اُس وقت کے حالات کو آج کے تطابق میں درست قرار دیا جاسکتا ہے.........؟ جس ریچھ کی آپ بات کررہے ہیں وہ تنہا تھا اور ہمارے اعلیٰ ذہنوں نے اُسے بتدریج دیوار سے لگانے کی تدبیریں کی تھیں جب کہ ہمارا موجودہ دشمن جابجا ٹکڑیوں کی شکل میں بٹا ہوا ہے اور اب' اُن کی مدد کے لئے ایک نیولا بھی بل سے باہر آکر پھنکارنے لگا ہے.........! خدانخواستہ! اُن کے

ساتھ وہ بھی میدان میں کود گیا تو آپ کیا کریں گے.........؟''

''نہیں صاحب ہر گز نہیں.........! مجھے آپ سے اختلاف ہے اور اس اختلاف کی وجوہات بھی انتہائی ٹھوس ہیں......... دیکھئے! ہم ایک عرصے سے عالمی تجارت پر قابض ہیں اور بعض شعبوں میں ایک کے عوض ایک ہزار تک منافع کما رہے ہیں دیکھا جائے تو یہ نظریئے وغیرہ کی لڑائی اوپری باتیں ہیں اصل جنگ معاش کی ہے اور ہم نے اُسے نناوے کے پھیر میں الجھا دیا ہے.........!''

''آپ کی گفتگو پھر ابہام پیدا کر رہی ہے.........؟''

''قطعی نہیں.........! آپ جس ہوّے کی نشاندہی کر رہے ہیں ہم نے اُسے جوتے، موزے، تیل، پھلیل، بینڈ باجا اور سوئی دھاگے کی معمولی تجارت میں الجھا کر پوری دنیا میں اس کے مفادات کی فصل لہلہا دی ہے اور بدلے میں اُس کے ہاں کھل کھیلنے کی آزادی حاصل کر لی ہے.........! آپ بتایئے.........! آپ میں سے کس کے ہاں وہ ٹکے ماری کرتا نظر نہیں آتا.........؟ کیا اُس کے دماغ میں پھوڑا نکل آیا ہے کہ وہ ایک طبقے کی حمایت حاصل کرنے کے لئے دنیا کی سب سے بڑی آبادی کو نانِ جویں کے لئے ترسائے اور خود اپنی تباہی کا سامان کرے.........؟''

''ہمارے اور اُن کے زمینی فاصلے پر آپ نے یقیناً غور فرمایا ہوگا اگر ہم وہاں اُبلنے والے نفرت کے لاوے سے صرفِ نظر بھی کر لیں تو اتنی بڑی تعداد میں بلا اُن کے زمینی تعاون کے اپنی فوج اور سامانِ حرب کو وہاں پہنچانا کس طرح ممکن ہے.........؟''

''مجھے سب سے پہلے آپ کی نکتہ آفرینی پر داد دینا چاہئے......... حضور والا! اگر ہم صفحہ چار سو بیس کا بغور مطالعہ کریں تو اُس کے بعد اس سوال کی سنگینی کسی قدر کم ہو سکتی ہے.........! ہم نے یہ کب کہا.........؟ ہماری مسلح افواج تن تنہا یہ معرکہ سرانجام دیں گی اور ان کے عملی تعاون کے بغیر دیں گی.........؟ جنابِ والا! ہماری افواج کے شانہ بشانہ نہ صرف ہم سب کی مسلح فورسز بلکہ تمام متاثرین (جہاں آپ کے خیال میں ہنگاموں اور ہڑتالوں کا خدشہ ہے) کی مسلح طاقتیں بھی اس مہم جوئی میں ہراول دستے کا کام دیں گی.........!''

''یہ اگر ممکن ہے تو.........! آپ معجزوں پر قادر ہو چکے ہیں.........! میں چاہوں گا کہ آپ تفصیل سے اپنے منصوبے پر اظہارِ خیال کریں.........!''

''میرے محترم.........! ایک عشرہ قبل ریتلے علاقے میں سَر کیے گئے معرکہ پر توجہ مرکوز

کریں تو آج کی صورتحال بخوبی سمجھ آسکتی ہے.........! کیا اُس وقت اُن کی برادری میں ہلچل اور ہیجان نہ تھا.........؟ کیا اُس وقت ہمارے خلاف جلسے' جلوس' گھیراؤ' جلاؤ کی تحریکیں نہ چلی تھیں.........؟ ایسے مواقعوں پر ہمارا طریقۂ کار یہ ہے کہ ہم انتہا پسندوں کے میدان میں آنے سے قبل اپنے تنخواہ داروں کے ذریعے ہنگاموں اور ہڑتالوں کو ہائی جیک کر لیتے ہیں۔ جس کے ردِعمل میں ہونے والے ہنگامے اور ہڑتالیں' ہمارے مکمل کنٹرول میں بھی ہوتے ہیں اور وہاں کے اُجڈ اور جذباتی عوام کا کتھارسس بھی ہو جاتا ہے.........!''

''جنابِ والا.........! جہاں تک سوال ریگستانی علاقوں کا ہے وہاں تک تو ہم آپ کے طریقہ کار کی داد دیئے بنا نہیں رہ سکتے.........! کسی کو آپ نے ملکِ عدم روانہ کر کے نجات پالی' کسی کو اقتدار کا لولی پوپ تھما دیا' کسی کے عقد میں حسینۂ شاطر دے کر ہمیشہ کی نگرانی کا بندوبست کر لیا' کسی کو ایک صدی کی خریداری کے شکنجے میں کس لیا' کسی کو حفاظتی ہوّے میں مقید کر لیا' کسی کو بے مقصد مہم جوئی پر لگا دیا.........! باقی بچنے والوں کو جوئے' شراب اور کسینو کے طواف میں مُبتلا کر دیا......... البتہ! مہلک کھلونوں کے عاشقوں سے آپ کا عمل' کسی قدر مبہم اور ناعاقبت اندیشی پر بیس کرتا ہے.........؟ وہاں پر ہماری حکمتِ عملی کی کمزوری کے اسباب کیا ہیں.........؟ نصف صدی سے ہم نے انہیں جاہل رکھ کر کیا حاصل کیا.........؟ کیوں ہم وہاں نت نئے گھوڑوں کی تیاری پر توانائی صرف کرتے اور پھر اُسے سرپٹ دوڑنے سے پہلے ہی ناکارہ سمجھ کر دوسرے گھوڑے پر داؤ لگانا شروع کر دیتے ہیں.........؟ اکثر اوقات ایک وقت میں ایک سے زائد گھوڑوں کی افزائش بھی کی جاتی ہے.........! اور سب سے حیرت کی بات یہ ہے کہ آپ نے خود ہی وہاں جنونیت کی تمام اقسام کے پودے کاشت کر کے' نفرت کی گرم ہواؤں کا رخ اپنی جانب کر لیا اور اب آپ انہیں کی بیخ کُنی کے لئے اتنے بڑے پیانے پر خطرات سے کھیلنے کا عزم رکھتے ہیں.........!''

''مجھے خوشی ہے کہ آپ نے اِس موضوع پر کُھل کر روشنی ڈالی.........! آپ کے دائیں' بائیں اور پُشت والے بھی آپ کے خیال کی تائید میں ہاتھ بلند کر کے ہم آہنگی کا ثبوت دے رہے ہیں.........! ہمیں خوشی ہو گی اگر آپ گاہے بگاہے ہماری کارکردگی کو اسی طرح جانچتے پرکھتے رہا کریں اس طرح ہمیں اپنی اصلاح کا موقع میسر رہے گا.........! میں آپ کے سوال کی جانب آتا ہوں.........! یہ تو آپ بخوبی جانتے ہیں کہ ہماری دوستی اور دشمنی' ذاتی بنیادوں کے بجائے مفادات کے تحت ہوا کرتی ہے۔ مفادات کا تقاضا یہ ہے کہ منہ دیکھ کر تھپڑ مارنا چاہئے سو ہم اُن لوگوں کے ساتھ اُن کے مزاج' نفسیات اور اوقات کے مطابق ڈیل کر رہے ہیں جس کے ثمرات مستقبل میں بھی

ہماری مرضی کے مطابق رہے ہیں اور آئندہ بھی ہماری منشاء کے مطابق ہی ہوں گے.........! جہاں تک سوال جنونیت کی فصل بونے کا ہے تو یہ کام ہم نے سالہا سال کی تحقیق اور اُن لوگوں کی نفسیات کو سامنے رکھ کر کیا ہے.........! آپ کو علم ہے کہ وہ لوگ انتہائی کچے عقیدے اور اندھی تقلید کے قائل ہونے کی وجہ سے دماغ کے بجائے دل سے سوچتے ہیں۔ ہم نے اسی سوفٹ کارنر کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے' وہاں جنونیت پھیلا کر اُن کے عقائد اور نظریئے سے عام آدمی کو پوری طرح بیزار کر دیا.........! آپ کو معلوم ہے کہ وہاں کا عام آدمی (مراد نیم خواندہ سے ہے) کچھ عرصہ پہلے تک مولوی' مُلاّ' پیر' فقیر اور حاجی' نمازی کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا اب تحقیر آمیز الفاظ سے یاد کرتا ہے اور جب ہم اسی تحقیر آمیز طبقے پر ضرب کاری لگائیں گے تو تمام خواندہ و نیم خواندہ افراد کے ساتھ ان پڑھ لوگوں کی معقول تعداد بھی ہماری ہمنوا بن جائے گی.........! اب میں آتا ہوں گھوڑوں کی افزائش کی جانب.........! یقیناً آپ کا سوال گزشتہ دنوں' ایک ہی وقت میں سفید گھوڑے اور خاکی گھوڑے کی پُشت تھپتھپانے کے ردِعمل میں ہوا ہے.........! یقین مانیئے! ہمارا طرزِ عمل' اچانک یا کسی جذباتی سوچ کا نتیجہ ہرگز نہیں.........! ماضی میں بھی ہم ایک ہی وقت میں کئی کئی گھوڑوں کو بیک وقت دانہ دنکا ڈالتے رہے ہیں.........! پشت ہا پشت سے غلام ذہنیت رکھنے والے حکمران بنتے ہی پاگلوں کا سا عمل شروع کر دیتے ہیں۔ اُن کے بدبودار ذہن میں ہیرو بننے کا خنّاس سر اُبھارنے لگتا ہے۔ ایک طرف وہ ہم سے وعدے وعید کر رہے ہوتے ہیں دوسری طرف ہماری تباہی کے خوابوں میں رنگ بھرنے کے لئے شعلوں سے کھیلنے لگتے ہیں لہٰذا ہمیں تازہ دم گھوڑا ہر وقت تیار رکھنا ہوتا ہے تاکہ منہ زور گھوڑے کی لگامیں کھینچ کر اپنی پسند کے گھوڑے کے لئے میدان فراہم کیا جائے.........! اس بار ہم نے دانستہ سفید اور خاکی گھوڑے کو ایک ساتھ اس لئے ہشکارا دیا کہ کہیں سفید گھوڑے زیادہ وزن کے باعث بِدک نہ جائیں اور اُن کے بِدکنے کی صورت میں خاکی گھوڑے سے اُن کا شیر و شکر ہونا بھی یقینی تھا.........لہٰذا! ہم نے جو کام ماضی کے لئے اٹھا رکھا تھا اُسے بھی لگے ہاتھوں نمٹا دیا یعنی خاکی گھوڑے کی تیز رفتاری اور صحت مندی کے میدان میں نوک دار کیلوں کا جال بچھا دیا اب اُس کی پیٹھ پر بھی استعداد سے زیادہ وزن ہے اور پیروں کے نیچے نوکدار کیلیں ہیں۔ وہ جتنا دوڑنے کی کوشش کرے گا اتنا لہولہان ہوگا۔ اس طرح ہلدی اور پھٹکری کے بغیر ہمارے خوابوں کی تکمیل ہوگی.........!''

''میرے دوست.........! اس طویل تمہید کے باوجود آپ یہ ثابت نہیں کر سکے کہ ہماری افواج کو اُن کا زمینی اور تیکنیکی تعاون کس طرح حاصل ہوگا.........! بھلا کبھی کسی نے قربان ہونے

کے لئے اپنی شہ رگ پر خود چُھری چلائی ہے.........؟''

''اس بار یہ معجزہ بھی آپ بچشم خود دیکھیں گے.........! اِس کے علاوہ اُن کے لئے ہم نے کوئی راستہ باقی ہی نہیں چھوڑا.........! پہلی بات تو یہ کہ ہم نے اُن کی معاشی مُشکیں کسنے کے ساتھ حربی طور پر بھی اُنھیں زیر کرنے کی پوری منصوبہ بندی کرلی ہے جس کے ردِعمل میں اُن کی پچاس سالہ تعمیر و ترقی پچاس منٹوں میں ملیامیٹ ہو جائے گی اور اُن کے جاہ طلب لوگ یہ سودا آسانی سے قبول نہیں کریں گے.........!''

''یعنی آپ ایک وقت میں ایک سے زائد محاذ کھولنے کی تیاری کئے بیٹھے ہیں.........؟''

''اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ ہم سے پہلے ہمارا پردھان جو پچاس سال سے اُن پر دانت تیز کیے بیٹھا ہے ہمارے ایک اشارے پر اپنے سارے حساب چُکانے کے ساتھ ہمارا راستہ بھی آسانی سے صاف کر دے گا۔ اب اِن کے ایک طرف کنواں ہے اور دوسری طرف کھائی یعنی ایک طرف اُن کا ازلی دشمن اور دوسری طرف اُن کے رضاعی ماں باپ.........! فیصلہ یقیناً ہمارے حق میں ہوگا کیوں کہ ہم نہ صرف اُن کی سلامتی کے ضامن بلکہ اُن کے اَن داتا بھی ہیں.........!''

''تمام شرکا کی گفتگو سے محظوظ اور متفق ہونے کے باوجود میرے ذہن میں یہ سوال کافی دیر سے دستک دے رہا ہے کہ تمام کارروائی اور کامیابی اُس وقت کیوں حاصل نہ کی گئی جب نشان زد سرزمین پر ہمارے تنخواہ دار حکمران موجود تھے۔ اس طرح خون خرابہ بھی کم ہوتا اور مقصد بھی آسانی سے ہاتھ آجاتا.........!''

''یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے.........! ہم نے کبھی کسی ایک مقصد کے لئے ناک کی سیدھ میں چل کر قطعاً کوئی کام نہیں کیا.........! ہمارا ہر قدم اور ہر عمل کثیر المقاصد ہوتا ہے.........! لہٰذا یہ مہم جوئی بھی بہت سے مقاصد کی براری کے لئے کی جارہی ہے.........! اوّل ان کے عقیدے اور نظریئے کو ہمیشہ کے لئے نہ سہی تو ایک صدی کے لئے ضرور پچھاڑ دیا جائے.........! دوم پوری دنیا میں اپنی طاقت کی دھاک اس طرح بٹھا دی جائے کہ آئندہ کوئی ہمارے خلاف سوچنے کی جرأت بھی نہ کرے.........! سوم ہماری اسلحہ ساز فیکٹریاں ایک عرصے سے تجارت کی کساد بازاری کے باعث بند پڑی ہیں اور اُن کے گوداموں میں بے پناہ مالیت کا اسلحہ زنگ آلود ہورہا ہے۔ اُس کا استعمال.........! چہارم اب تک ہم نے ہتھیاروں کے باب میں جتنی ترقی کی ہے اُتنی استعمال نہیں ہوئی......... لہٰذا! اس بار پہاڑوں کی سرزمین کا انتخاب اس لئے کیا

گیا ہے کہ ہم اپنے ترکش کے تمام تیروں کی استعداد اور کارگزاری جانچیں، پرکھیں اور اُن کی مزید بہتری کے لئے نئے سرے سے تحقیق کا اہتمام کر کے، اُنھیں زیادہ مہلک اور کارآمد بنائیں اور زیادہ سے زیادہ نئے آرڈر لے کر اپنی اسلحہ ساز فیکٹریوں کو کام میں مصروف کر کے دنیا کی دولت سے اپنا حصّہ پوری طرح وصول کریں.........!

''جناب والا.........! آپ نے جس چابکدستی سے اپنے مفادات کا درخت کاشت کیا ہے اُس کی جڑیں بہت دُور تک پھیل چکی ہیں.........! خدانخواستہ اس ساری کارروائی میں اصل ٹارگٹ اور اُس کا دست راست آپ کی گرفت سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تو وہ آگ کے شعلوں کو اس قدر ہوا دے سکتے ہیں کہ جس کا بیان بس سے باہر ہے.........!''

''آپ نے یہ سوال کر کے میرے تنے ہوئے اعصاب کو پُرسکون کر دیا.........بندہ پرور! اُن کا کردار ہمارے اسکرپٹ میں ابھی ختم نہیں ہوا.........! اُن کی زندگی اور اُن کی موجودگی ہماری اُس خطّے میں مصروفیت کا جواز ہے جسے ہم ہرگز ضائع کرنا نہیں چاہتے.........! ہم نے خاص طور پر یہ ہدایات جاری کر دی ہیں کہ پرائم سسپیکٹس کو کسی قیمت پر گزند نہ پہنچائی جائے.........! اُن کی سلامتی، ہماری بقا کی ضامن ہے.........!

''جہاں تک میں سمجھتا ہوں.........! تمام شرکائے محفل آج کی بریفنگ سے متفق اور مطمئن ہونے کے ساتھ مسرور بھی ہوں گے.........! واقعی آپ کی پلاننگ بہت دوُر اندیشی اور ہنرمندی سے عبارت ہے۔ البتہ.........! ایک نکتہ اب بھی وضاحت طلب ہے.........! آپ نے یہ ہی قوم، یہ ہی خطّہ اور یہ ہی وقت اِس مہم جوئی کے لئے کیوں منتخب کیا.........؟''

''اس برمحل اور بروقت سوال کا جواب انتہائی سادہ ہے.........! ہم نے اُنھیں کی مقدّس کتاب کے ایک قول کو مشعل راہ بنایا ہے.........! ''خُدا نے اُس قوم کی حالت کبھی نہیں بدلی جو خود اپنی حالت نہ بدلنا چاہتی ہو۔'' ہم حرکت کے قائل ہیں اور وقت کے ساتھ چلنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہمارے ہر فیصلے اور عمل میں، عقل و شعور کارفرما ہوتا ہے......... لہٰذا! ہم نے یہ وقت بہت سوچ سمجھ اور غور و فکر کے بعد منتخب کیا ہے.........! یہ لوگ عقل کے اندھے اور جذبات کے غلام ہیں......... عقائد کی لکیر پیٹ کر معجزوں کو پکارنے کے عادی ہیں.........! بہت دیر پہلے، محترم دوست نے سوال کیا تھا کہ ہماری مرضی و منشا کے مطابق خودکُش رضاکار، کس طرح اہداف پورے کریں گے.........؟ دوستو.........! میری دھیمی آواز پر پوری توجہ کرتے ہوئے، میرے الفاظ نہایت غور سے سنیئے.........! عقیدے کے مطابق اُن کی کامیابی اور کامرانی کا وقت آن پہنچا

ہے........ لہذا! ہم نے بیتابی کی سان پر' عجلت کی دھار لگاتے ہوئے اُن کے اذہان میں یہ چیز راسخ کر دی........... کہ تم چاہو تو طاقت کے بَل پر' اپنے عقیدے کے مطابق معجزہ کر کے دنیا کی حکمرانی حاصل کر سکتے ہو.......... ہا ہا ہا ہا........ بیچارے کہیں کے........ دن رات رٹتے نہیں تھکتے........!

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

نفرت ہوتے ہوئے بھی مجھے اُن پر ترس آرہا ہے........! مقاصد کی تکمیل کے لئے' عمل کے بجائے' عقیدے کے اندھے کنویں سے معجزوں کی اُمید میں.......... بے موت مارے گئے........ ہاہاہاہا........ بے موت مارے گئے........!!!

☆☆☆

میر صاحبنی

ماڈرن آبادی کے جدید اور کشادہ گھر میں رہتے ہوئے بھی میر صاحبنی کی طبیعت میں ذرّہ بھر فرق نہ آیا تھا۔ ہمیشہ کی طرح ان کا مزاج آج بھی خزاں رسیدہ درخت کی مانند سخت اور کھردرا ہونے کے ساتھ ثقیل بھی ہو گیا تھا۔ جس طرح بارش کی کمیابی اور زمین کی سختی سے درخت کی جڑوں میں رواں خوراک کی رفتار سُست اور بوجھل ہو جایا کرتی ہے۔ جس کے باعث درختوں میں عجب طرح کی ویرانی اور اُجاڑ پن نمایاں ہو جاتا ہے بالکل اسی طرح میر صاحبنی کی رگوں میں دوڑتا خون بھی پے در پے صدمات کے باعث سُست اور بوجھل ہو گیا تھا۔ جس کے باعث کوئی موذی مرض نہ ہونے کے باوجود بھی، وہ سو امراض کا مجموعہ بن کے رہ گئی تھیں۔ زندگی میں اُن کی دلچسپی اولاد کے باعث تھی وگرنہ اُن کی دنیا تو اُسی دن لُٹ گئی تھی جس دن میر صاحب اُنہیں اس دنیا میں یک وتنہا چھوڑ گئے تھے۔ غلطیاں میر صاحبنی نے بھی زندگی میں کم نہ کی تھیں مگر کبھی کبھی وہ یہ ضرور سوچتیں! اگر اللہ میاں سبھی گناہ گاروں کو اس طرح سے دنیا میں سامانِ عبرت بنا دیا کرتے جس طرح میر صاحبنی کو بنایا ہے تو اس دنیا کی صورت کیا ہوتی اور ہمارے چہروں پر چڑھے غلافوں کے لئے قبرستان سے بھی زیادہ جگہ درکار ہوتی۔

خیالات کا تانا بانا بہت سی گتھیوں کی الجھی ڈور کو سلجھانے کی سعی میں مصروف رہتا اگر گاڑی کے پریشر ہارن کی مخصوص آواز میر صاحبنی کی سماعت کو ماضی کی زندہ مگر پُرخار وادیوں میں براہ راست کھینچ نہ لیتی۔

مخصوص جگہ پر گاڑی پارک کر کے ریاض حسبِ عادت Back- Mirror سیٹ کرتے ہوئے مونچھوں کا زاویہ درست کرتا اور مخصوص انداز میں ہارن سے تین آوازیں نکال کر گاڑی سے نیچے اُتر جاتا۔ سب سے پہلے وہ اپنی پشاوری چپلوں کو زمین پر جھٹک کر گرد جھاڑتا‘ طبیعت پھر بھی مطمئن نہ ہوتی تو ڈرائیونگ سیٹ کے نیچے سے پیلے رنگ کا دبیز کپڑا نکال کر اُس کا جھاڑن بناتا اور دونوں پاؤں کی جوتیوں کے دائیں بائیں کی مٹی جھاڑ کر گاڑی کی ونڈ سکرین کو چمکانے لگتا۔ اس دوران وقفے وقفے سے سر گھما کر پیچھے کی جانب بھی دیکھتا جاتا۔ گاڑی کی ونڈ سکرین کی صفائی سے مطمئن ہو کر دائیں بائیں کے دروازوں کو چمکاتا ہوا جب وہ گاڑی کے پچھلے حصے کی طرف رواں ہوتا تو اکثر ڈینٹ کے تازہ نشان پر اُس کی نظریں ٹھہر جاتیں جس کے باعث اُس کے چہرے پر تناؤ اور تشویش کی ملی جلی کیفیت نمایاں ہو جاتی جس کے ردِعمل میں وہ اپنی قمیض کی داہنی جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ کی ڈبی برآمد کرتا اور اُس میں سے ایک سگریٹ نکال کر اُس کے دونوں سروں کو باری باری سگریٹ کی ڈبی پر ٹھونکنے کے بعد سگریٹ کا ایک سرا زبان پر پھیر کر گیلا کرتا اور خشک سرے کو ہونٹوں میں دبا کر سگریٹ سلگاتا چوڑی چکلی جفاکش چھاتی کا تمام زور صرف کرتے ہوئے لمبا کش کھینچ کر پھر سے گہری سوچ میں مبتلا ہو جاتا۔ ایک ایک کر کے سیٹھ صاحب کی وہ تمام زیادتیاں یاد آنے لگتیں جو گاڑی کو نقصان پہنچنے پر گاہے گاہے سیٹھ صاحب نے اس کے ساتھ کی تھیں۔

دنیا میں بہت کم انسان اس طرح کے ہوں گے جو ایک بار غصہ آنے کے بعد اُس کا اظہار کیے بغیر نارمل ہو جائیں۔ ریاض کا تمام تر غصہ اس کے دائیں ہاتھ کی پہلی انگلی میں منتقل ہو کر نوشی کے گھر کی کال بیل پر پڑ چکا تھا جس کے جواب میں کھولتی ہانڈی کی مانند‘ نوشی کی والدہ برآمد ہوتیں اور ریاض کو جاہل ہونے کا طعنہ دیتے ہوئے شریفوں کے گھر کی گھنٹی بجانے کا طریقہ سکھانے لگتیں۔ جواب میں ریاض‘ طے شدہ طریقہ کار کے مطابق نوشی کے باہر نہ آنے پر غصے کا اظہار کرتے ہوئے‘ لفظ شریف کو منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگتا۔

ریاض ایک غریب مگر خوددار ملازم تھا غلط بات کہتا نہ برداشت کرتا تھا۔ نوشی کے گھر وہ اپنی خوشی یا ضرورت کے لئے نہ آتا تھا وہ تو حکم کا غلام تھا۔ جب بھی سیٹھ صاحب کو بااختیار دوستوں کی دعوت مقصود ہوتی یا بڑی ڈیل کا موقع درپیش ہوتا وہ نوشی کی والدہ کو فون پر مطلع کر دیتے اور ریاض سیٹھ صاحب کے مقررہ وقت پر نوشی کے گھر کے باہر آ کر تین بار ہارن سے مخصوص آواز نکالتا جس کے جواب میں سجی بنی نوشی‘ گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر اپنی زلفوں کو سمیٹتی آ بیٹھتی۔ اس کے پرفیوم کی تیز خوشبو ریاض کے نتھنوں میں سوزش پیدا کرنے لگتی۔ ریاض تیز رفتاری سے گاڑی بھگا کر تازہ ہوا میں

لمبے سانس لیتا اور نا گوار بُو سے چھٹکارا حاصل کرتا۔

خلافِ توقع آج! نوشی تیار تھی اور نہ ہی اس کا ریاض کے ہمراہ جانے کا ارادہ تھا۔ وجہ' نوشی کی والدہ نے ریاض کو صاف صاف لفظوں میں بتا دی ''پانچ سالوں سے سیٹھ صاحب نے ایک ہی دام رکھے ہوئے ہیں۔ اس عرصے میں ضروریاتِ زندگی اور معیارِ زندگی میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے۔ ان پانچ سالوں میں' سیٹھ صاحب نے نت نئے بنگلے' مل فیکٹری' فارم اور نئے ماڈل کی بے شمار گاڑیاں خریدنے کے علاوہ الیکشن میں بھی بے پناہ دولت لٹائی ہے! یہ سب کچھ خالی خولی عقل کے زور پر حاصل نہیں ہوا اس میں نوشی کی اٹھتی جوانی اور مردوں کو ایک ہی وار میں ڈھیر کرنے کی صلاحیت کا بڑا دخل ہے۔ جس کا حصہ نوشی کو ملنا چاہئے! یکمشت نہیں' نہ سہی' آج سے نوشی فی پھیرا تین گنا وصول کرے گی؟'' چربی چڑھے بے ڈول کولہوں پر ہاتھ رکھ کر بازاری انداز میں آنکھیں مٹکاتے ہوئے نوشی کی والدہ نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ جس کے بعد ریاض وہاں ایک پل نہ ٹھہرا۔ ریاض کو بے دلی سے جاتا دیکھ کر ہارے ہوئے جواری کی مانند میر صاحبنی نے کمزور لہجے میں اپنی بات پھر سے دہرائی۔ ''سیٹھ صاحب سے کہنا اگر انہیں منظور ہو تو جلدی فون کر دیں ورنہ نوشی کی راہ میں دل بچھانے والوں کی لائن لگی ہوئی ہے۔''

میر صاحب درمیانے درجے کے کھاتے پیتے خاندانی آدمی تھے۔ پہلی بیوی کی بے وقت موت اور اولاد کی بے مروتی نے انہیں دوسری شادی پر مجبور کر دیا تھا۔ بدقسمتی سے ان کی دوسری بیوی کا تعلق بہت اچھے خاندان سے نہ تھا۔ جس کا احساس میر صاحب کو شدت سے ہوا کرتا۔ دوسری بیگم کے بطن سے تین بیٹیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ ان کی آزاد خیالی اور آزاد روی کے باعث جلد ہی میر صاحب ساری جمع پونجی سے محروم ہو گئے تھے جس کے بعد بیگم کا رویہ زیادہ ہی بے باکانہ ہو گیا تھا۔ گھر کا سارا نظام بیگم کے منہ بولے بھائی چھّن میاں چلایا کرتے تھے جس کے باعث میر صاحب کی زندگی کے آخری ایام انتہائی کسمپرسی اور کرب میں گزرے۔ بیگم کی من مانی اور بیٹیوں کی آزاد روی کے باعث میر صاحب وقت سے پہلے دنیا سے رخصت ہو گئے۔

میر صاحب کی موت ان کی بیگم کے لئے آزادی کا پیغام تھی۔ اُن کی خواہشوں اور ارادوں میں اب کوئی چیز حائل نہ تھی۔ تھوڑے ہی عرصے میں گھر کے سارے طور طریقے بدل گئے۔ چیتھڑوں میں نظر آنے والی میر صاحب کی بیگم جنہیں اہلِ محلّہ میر صاحبنی کہا کرتے تھے' کینچلی بدل چکی تھیں۔ بھڑکیلے لباس اور گاڑھے میک اپ میں ان کا زیادہ وقت گھر سے باہر گزرتا۔ بہت سا وقت ضائع کرنے اور بھانت بھانت کے لوگوں سے جی بھرنے کے بعد کام کا آدمی ہاتھ لگا جن کا گھر آنا جانا

شروع ہو گیا۔ سیٹھ صاحب میر صاحبنی کے ساتھ اُن کی بیٹیوں کے لئے بھی رنگا رنگ تحائف لے کر آنے لگے جس نے میر صاحبنی کی بڑی بیٹی، نوشی کی اٹھتی جوانی میں زہر گھول دیا۔ سیٹھ صاحب کے آزمودہ ہتھکنڈوں کی بدولت، نوشی نے بہت جلد ماں کی جگہ لے لی۔ نوشی کی جوانی سے سیٹھ صاحب نے نہ صرف اپنا بڑھاپا تابدار کیا بلکہ نوشی کے بروقت اور درست استعمال سے ڈھیروں مال بھی بنایا۔

شروع شروع میں میر صاحبنی اور سیٹھ صاحب کے درمیان لین دین کے معاملے پر کچھ تنازعہ بھی رہا پھر باہمی رضامندی سے نوشی کے دام مقرر کر دیئے گئے۔ یہ سلسلہ کئی برس خوش اسلوبی سے چلتا رہا۔ مقررہ رقم کے علاوہ بھی سیٹھ صاحب، موڈ اور ڈیل کی مناسبت سے نوشی اور اس کے گھر والوں کو نوازتے رہتے۔ پوش علاقے میں واقع نوشی کا یہ جدید گھر بھی سیٹھ صاحب کی دین ہے۔

کچھ عرصے سے نوشی کی والدہ اُکھڑی اُکھڑی سی تھیں۔ سیٹھ صاحب کی طرف سے ملنے والا معاوضہ انہیں مطمئن کرنے کے لئے کافی نہ تھا۔ وہ سیٹھ صاحب سے دوٹوک بات کرنا چاہتی تھیں جب کہ سیٹھ صاحب پکڑائی نہ دیتے تھے۔ تنگ آکر! انہوں نے ریاض کے ہاتھ اس امید پر پیغام بھیجا کہ اُن کی دھمکی پر سیٹھ صاحب دوڑے چلے آئیں گے کیونکہ میر صاحبنی نوشی کو سیٹھ صاحب اور اُن کے کاروبار کے لئے ناگزیر گردانتی تھیں مگر سیٹھ صاحب نے نوشی کی والدہ کے تقاضے کو اپنی بے عزتی سمجھا اور ہمیشہ کے لئے ان کے گھر سے لاتعلق ہو گئے۔

سیٹھ صاحب سے آزادی پر میر صاحبنی بہت خوش تھیں۔ وہ تو کھلی ہواؤں اور آزاد فضاؤں میں اُڑنے کے لئے بیتاب تھیں۔ اُنہیں اس بات کا قطعی اندازہ نہ تھا کہ جس منہ کو تازہ خون کا ذائقہ لگ جائے وہ دنیا کی تمام لذتوں سے منہ موڑ لیتا ہے۔ میر صاحبنی نوشی کو سیٹھ صاحب کے قبضے سے آزاد کرانا چاہتی تھیں مگر اب ان کی اپنی بیٹی پر گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی تھی۔ کماؤ مرد نخریلا یا غصیلا ہوا کرتا ہے جب کہ کماؤ عورت زہریلی ہوا کرتی ہے۔ جس کی مٹھی میں نہ صرف خاندان کی عزت نفس بلکہ ایڑی کے نیچے شوہر بھی کراہ رہا ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ میر صاحبنی کو اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ سیٹھ صاحب! تماش بین ہونے کے باوجود جہاں دیدہ، کاروباری اور وعدے کے پکے انسان تھے۔ اُن کی چار دیواری میں نوشی ہر طرح سے محفوظ ہوا کرتی تھی مگر ہر روز نئے آدمی اور نئی گاڑی کی آمد سے میر صاحبنی کا دل دہلنے لگتا۔ نوشی کے رویے میں پہلی سی سعادت مندی نہیں رہی تھی۔ وہ قریب قریب خودمختار ہو چکی تھی۔ اُس کی آمدنی کے بارے میں کسی کو کچھ علم نہ تھا۔ رقم ماں کے ہاتھ میں لا کر دینے کے بجائے بنک میں اپنا اکاؤنٹ کھول لیا تھا۔ اُس کے رہن سہن اور بول چال میں بہت بے باکی آ گئی تھی۔ نت نئے ڈیزائن کے کپڑوں اور زیورات کے علاوہ ڈریسنگ ٹیبل پر ڈھیروں کے حساب

سے خوشبوئیں اور میک اپ کا سامان سج چکا تھا اور اس کا زیادہ وقت شیشے کے سامنے گزرنے لگا تھا۔ بات بات پر غصہ کرنا اور گھر چھوڑنے کی دھمکی دینا بھی اس کا معمول بن گیا تھا۔

میر صاحبنی بے شک اچھی عورت نہ سہی مگر ہر کام سلیقے' قرینے اور قاعدے سے کرنے کی ضرور قائل تھیں۔ گھر اور بازار کے درمیانی فاصلے کو برقرار رکھنا جانتی تھیں' جو روز بروز گھٹتا جا رہا تھا۔ کچھ عرصے سے نوشی کے معمولات میں نمایاں تبدیلی نظر آ رہی تھی۔ ہر روز نئی گاڑی اور نئے آدمی کے بجائے' نئے ماڈل کی ایک لمبی کار تواتر سے نوشی کو لینے آ رہی تھی۔ نوشی ہر شام بے چینی سے اس گاڑی کا انتظار کیا کرتی۔ اُس کی تیاری کا انداز' بازاری عورت کے بجائے سگھڑ بیوی کا سا ہوتا جو روٹی روزگار کی تلاش سے تھکے ماندے شوہر کی واپسی پر اُس کی دلجوئی کا سامان مہیا کر رہی ہوتی ہے۔ میر صاحبنی کی جہاں دیدہ آنکھیں بیٹی کے انگ انگ میں محبت کی خوشبو محسوس کر رہی تھیں اور اَن دیکھے خواب سجانے میں مصروف تھیں۔ مشرقی مائیں تو بیٹی کی اُٹھان کے ساتھ ہی بوڑھی ہو جایا کرتی ہیں جب کہ میر صاحبنی کے بعد تیزی سے نوشی کا سفر بھی اندھی گلی کی جانب شروع ہو چکا تھا۔ میر صاحبنی آج خود کو تپتے ہوئے صحرا میں کھڑے اُس مسافر کی مانند محسوس کر رہی تھیں جس کا زادِ راہ ختم ہو چکا ہو اور وہ اپنی راہ سے بھی بھٹک گیا ہو۔ آج مدت بعد انہیں شدت سے میر صاحب یاد آ رہے تھے۔ میر صاحبنی کو ایسا لگا جیسے میر صاحب ان کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہے ہوں! ''کب تک بیٹی کو بازار کی زینت بنائے رکھو گی۔ فقیر اور منگتے بھی ساتویں ہانڈی کے بعد گھر کا رُخ کیا کرتے ہیں کیا تم اُن سے بھی گئی گزری ہو گئیں؟''۔

فون کی گھنٹی سے میر صاحبنی اس طرح چونکیں جیسے گہری نیند سے آنکھ کھُل گئی ہو۔ دوسری طرف سے نوشی نے سپاٹ لہجے میں اپنے نہ آنے کی اطلاع دیتے ہوئے چند دن بعد واپسی کا کہہ کر فون بند کر دیا۔ میر صاحبنی گومگو کی کیفیت میں سراپا ملتجی آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے' من ہی من میں بیٹی کی سلامتی کے لئے دعائیں مانگنے لگیں۔

ایک ہفتے کے بعد نوشی کی واپسی اور عابد سے شادی کا اعلان میر صاحبنی کے اوپر گرمی کے سخت موسم میں یخ بستہ پانی کی بالٹی انڈیلنے کے مترادف تھا۔ وہ اپنی خوشی کو چھپاتے ہوئے پیش آمدہ خدشات وخطرات سے نوشی کو آگاہ کرنے لگیں۔ ''عابد کے بارے میں آپ کوئی ایسی ویسی بات نہ سوچیں وہ ایک شریف اور عزت دار آدمی ہونے کے ساتھ بڑے عہدے پر فائز ہے۔ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ اس نے نہ صرف مجھے تحفظ دینے کا وعدہ کیا ہے بلکہ آپ لوگوں کی ذمہ داری نبھانے پر بھی آمادہ ہے۔''

کوئی شخص کتنا ہی ایماندار، بااصول اور مہذب کیوں نہ ہو ضرورت، مصلحت یا منافقت کے تحت کبھی نہ کبھی جھوٹ بولنے پر مجبور ہو ہی جاتا ہے۔ عابد نے بھی نوشی سے پہلی شادی کی بابت غلط بیانی صرف ضرورت کے تحت کی تھی۔ اُس کا بااختیار عہدہ اُسے بے پناہ منفعت پہنچا سکتا تھا اگر اُس کی بیوی چینٹ، چالاک اور خوبصورت ہوتی جب کہ اُس کی بیاہتا، گاؤں کی سیدھی سادھی ٹمیار تھی اور تعلیم کی کمی نے اسے کبھی بھی کلچرڈ اور میریڈ شہری خاتون بننے پر آمادہ نہ کیا۔

ان دنوں پھر عابد کے دفتر میں نئی آسامیوں کی جگہ نکلی ہے جو ہمیشہ کی طرح اس بار بھی عابد کے قلم کی ذرا سی جنبش سے پُر ہو جائیں گی اور ہمیشہ کی طرح اس بار بھی عابد کی گاڑی خرابی کا بہانہ کر کے گیراج میں بند کر دی جائے گی اور ہمیشہ کی طرح ہی اس بار بھی بیگم عابد کو ہر شام کسی نہ کسی سائل کے ساتھ ضروری شاپنگ پر جانا ہوگا!!

ہارن کی مخصوص آواز پھر سے میر صاحبنی کے کانوں میں گونج رہی ہے۔ اُن کا دل بہت سے اندیشوں اور وسوسوں کے باعث میراتھن ریس دوڑنے لگا ہے۔ وہ نوشی کو آواز دے کر پیش آمدہ خطرے سے باخبر کرنے کے لئے آواز دینے کی کوشش کرتی ہیں تو ان کی آواز ان کے منہ سے نکلنے کے بجائے دل سے نکلتی محسوس ہوتی ہے جس میں الفاظ بھی ان کے نہ تھے۔

میر صاحبنی!! اتنی بھولی کیوں بنی ہو۔ تم اگر یہ سمجھتی ہو کہ نکاح کے دو بول پڑھنے یا پڑھانے سے کاروبار کی نوعیت تبدیل ہوگئی ہے تو تم سخت غلطی پر ہو۔ تم نے اوّل روز سے میر صاحب کی دولت کے عوض خود کو فروخت کر کے اپنی نسل کو غلاظت کے جس کاروبار پر لگایا ہے اُس کا نصب العین حصولِ زر ہے۔ اس کاروبار میں ریاض، سیٹھ صاحب یا عابد کی تمیز وقت کا ضیاع ہے!!!

شُبھ چنتک

''دادو! پھر کیا ہوا' بتایئے نا.........؟''

''ہونا کیا تھا بیٹا......... پوری کلاس' ہی ہی کر کے اِس طرح دانت کھسوڑ نے لگی جیسے اُن سب کے پیٹ میں چوہے چھوڑ دیئے گئے ہوں......... اُس دن تو دولڑ کے پریم اور عابد حبیب غیر حاضر تھے......... پوری کلاس تو نہ ہوئی.........؟ چوبیس میں سے دو گھٹا دیئے جائیں باقی بچتے ہیں بائیس......... بائیس لڑکوں کو پوری کلاس نہیں کہا جا سکتا.........! پریم بھی عجب ڈرامہ تھا......... ہر روز نئے نئے ڈیزائن کے کپڑے پہن کر آتا اور ہم جماعتوں پر' رعب جھاڑتا.........!

''اس طرح کی جرسی اشوک کمار نے' فلم ''ہم لوگ'' میں پہنی ہے.........! پتلون کا اسٹائل راج کپور سے ملتا جلتا ہے......... بالوں کی لٹ دلیپ کمار کے انداز میں ترشوائی ہے......... قمیض کا کالر دیو آنند اسٹائل کا بنوایا ہے.........''

''اتنے ڈھیر سارے پیسے تیرے پاس آتے کہاں سے ہیں اور تجھے سلوا کر کون دیتا ہے فیشنی کپڑے.........؟''

''ابے یار.........! تم بھی باؤلے ہو سارے......... یہ کپڑے میرے بڑے بھائی سُدھیر کے ہیں' میں تو اس کی چوری سے پہن کر آتا ہوں.........!''

''اور بال.........؟'' پریم کی بات میں وقفہ آتے ہی ہم میں سے کوئی بول پڑتا.........

''بال کٹوانے' میں اپنے بھائی کے ساتھ جاتا ہوں۔ جس ہیرو کے اسٹائل میں سُدھیر کٹنگ کراتا ہے میں بھی ضد کر کے ویسے ہی بال ترشوا لیتا ہوں......... پچھلے دنوں سُدھیر نے دلیپ کمار طرز کی لَٹ ماتھے پر لٹکوائی تھی' اس مرتبہ دیو آنند اسٹائل کا ٹپّا رکھوایا ہے.........!'' سر کے اوپری حصے کی جانب بالوں کے اُبھار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پریم چند شودگی دکھاتا اور ہم سب گونگلو بنے اُس کا منہ تکنے لگتے۔

''کیا بنے.........؟''

''بھئی محاورہ ہے......... پنجاب میں شلجم کو گونگلو بھی کہتے ہیں' سادہ بندے کو' گونگلو کی طرح' ڈب کھڑب سمجھتے ہوئے گونگلو سے ملا دیتے ہیں......... ڈب کھڑب کا مطلب نہ پوچھنے لگنا.........؟ ٹیڑھے میڑھے کے لئے استعمال ہوتا ہے.........''

''اُس وقت کے لحاظ سے ماڈرن اور پیسے والے ہوں گے پریم چند کے بڑے بھائی.........؟''

''آرٹسٹ بتایا کرتا تھا پریم چند حالانکہ اُس کے بھائی' سینما کے ہورڈنگ بنایا کرتے تھے اسی وجہ سے' اُن کے کپڑوں اور بالوں میں' فلمی ہیروز کی چھاپ نمایاں تھی......... تیسری دنیا میں غریب اور پسے ہوئے لوگ' فلمی ہیرو' ہیروئن سے اصل ہیروز کی طرح مرعوب ہوا کرتے ہیں اور اُن کی دیکھا دیکھی' ہیرو' ہیروئن بننے کی ناکام کوشش میں ضائع ہو جاتے ہیں.........''

''پیٹ میں چوہے چھوڑنے والی بات تو درمیان میں رہ گئی.........!''

''آتا ہوں......... آتا ہوں......... اُدھر بھی آتا ہوں......... پہلے پریم کی کہانی کا انت تو سُن لو......... ہماری تو خیر ہے وہ کم بخت مسلمان دوستوں کے ساتھ' اسکول اور گھر تک اس درجہ شیر شکر تھا کہ ہمیں اُس کے ہندو ہونے پر شک گزرنے لگا تھا......... غالباً سوموار کا دن تھا' اُس روز ناصر تاخیر سے پہنچا تھا......... آتے ہی اُس نے ساری کلاس کے سر پر آسمان گرا دیا تھا.........!''

''وہ کس طرح.........؟''

''ابھی ابھی میں نے پریم کو جم خانہ کلب میں جھاڑو دیتے دیکھا ہے.........!''

''ہیں.........!'' بہت سارے منہ ایک ساتھ کُھل گئے.........!

''قسم اللہ پاک کی......... اُس نے وہی قمیض پہن رکھی تھی جو مشہور ولن پران نے فلم ''آزاد'' میں پہنی ہوئی تھی......... جیسے ہی میں نے پریم اور اُس کی قمیض کو پہچانا' پریم او پریم کہہ کر

اُسے آواز دے ڈالی جس پر وہ چونک کر پلٹا اور اُس کے بعد اجنبی بن کر میری طرف پیٹھ کر کے پھر سے جھاڑو دینے لگا.........''

''ابے نہیں......... یہ کس طرح ہو سکتا ہے......... کل ہی تو اُس اُلو کے پٹھے نے' میرے ساتھ چار پائی پر بیٹھ کر ایک پلیٹ میں مزے لے لے کر بھنڈی گوشت کھایا تھا اور کلاس میں کسی کو نہ بتانے کی تاکید کی تھی......!'' شریف الدین حیرت کے کوزے میں ڈوبے کھاتے ہوئے' ایمان کی خرابی پر پریشان تھا.........!''

''کمال ہے یار.........! تجھے دھوکا تو نہیں ہوا.........؟''

''ابے باؤلا ہوا ہے......... کل کو آجائے گا سالا پریم' سب کے سامنے پوچھوا دوں گا.........ہاں نہیں تو.........!'' ناصر نے گھڑے سا سر اور گوریلا آنکھیں نکالتے وجے کمار' افضال احمد اور اصغر علی کو لاجواب کر دیا.........!

''پریم کے آنے پر' بڑا ہنگامہ ہوا ہو گا کلاس میں.........؟''

''اُس دن کے بعد پریم کبھی سکول نہیں آیا......... لڑکوں نے پریم کا پیچھا کر کے اُس کا گھر ضرور دیکھ لیا تھا جو بھنگی محلے میں واقع تھا.........!''

''اور وہ دوسرا لڑکا......... کیا نام تھا......... عابد حبیب......... وہ کیوں غیر حاضر تھا اُس روز.........؟''

''عابد حبیب' کوڑھ مغز اور غبی سا لڑکا تھا......... اُس روز' سبق یاد نہ کرنے پر ماسٹر جمعہ بخش کے مشہور زمانہ مولا بخش کی کارفرمائی سے اُس کا پاخانہ خطا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے وہ دوسرے دن کلاس سے غیر حاضر تھا......... ایک دن کے وقفے کے بعد عابد حبیب اسکول حاضر ہو گیا تھا......... دو ایک دن گُم سُم اور الگ تھلگ رہنے کے بعد معاملہ رفع دفع ہو گیا تھا کیونکہ ماسٹر جمعہ بخش نے سب لڑکوں کو تنبیہ کر دی تھی کہ اگر کسی نے اس واقعے کو بنیاد بنا کر عابد حبیب کو چھیڑنے یا کسی بھی طرح سے تنگ کرنے کی کوشش کی تو اُس کی ایک ساتھ دونوں چیزیں خطا ہو جائیں گی.........!''

''اب اصلی بات بھی بتائیں نا.........!''

''ماسٹر اشفاق حسین تھے تو اچولی کے پٹھان مگر ہندی اور سنسکرت میں اُن کے پائے کا اُستاد دُور دُور تک دستیاب نہ تھا۔ بھگوت گیتا کے اشلوک اور مہا بھارت کے کرداروں کے درمیان مکالمے کا آسان ترجمہ اتنی روانی اور عمدگی سے کرتے کہ آنکھوں کے سامنے زندہ ڈرامے کی کیفیت

پیدا ہو جاتی .... کچھ ایسا ہی انداز کالی داس، تُلسی داس، میرا بائی اور کبیر داس کے دوہوں کی تشریح اور ترجمہ کے وقت بھی پیدا کر دیتے .... ایک ایک نکتے کی وضاحت اتنی باریکی اور مہارت سے کرتے کہ بھُوگول کے ماسٹر تر ویدی صاحب اور انک گڑت کے اُستاد پر کاش چندر بھی ان کی مہارت کا لوہا مانتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگاتے .... ماسٹر اشفاق حسین نے اُس روز کلاس کے تمام لڑکوں کا ہندی میں عرضی یعنی چھٹی کی درخواست لکھنے کا ٹیسٹ لیا تھا اور سب سے اچھی درخواست لکھنے والے کو اپنی جیب سے نقد انعام دینے کا اعلان بھی کیا تھا......... کلاس کے سبھی لڑکوں کے لئے یہ مشکل بات نہ تھی......... ماسٹر اشفاق حُسین نے کئی بار ہمیں ہندی کی درخواست لکھنے کی مشق کرائی تھی جس میں ایک لفظ بھی دوسری کسی زبان کا شامل نہ تھا......... ایک لڑکے کو اس کے باوجود بھی ہول اُٹھ رہی تھی......... ہندو دھرم اور ہندو پریوار سے سمبندھ ہوتے ہوئے بھی ہندی زبان اُس کے لئے اجنبی اور اوکھی تھی......... مغربی پنجاب کے شہر راولپنڈی میں تعلیم پانے والا یہ بچہ اردو اور پنجابی زبان کے علاوہ دوسری کسی زبان سے اس قدر مانوس نہ تھا جس قدر اُس کے ہم جماعت ہندی زبان سے تھے.........!''

''ہیں دادو......... ؟پُرانے وقتوں میں ہمارے دیش میں لوگوں کو اپنی بھاشا نہیں آتی تھی.........؟''

''آتی تھی......... بہت سوں کو آتی تھی......... مسلم اکثریت والے علاقے کے لوگوں کو کم کم آتی تھی یا بالکل نہ آتی تھی.........''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ مسلمانوں کو ہندی نہیں آتی تھی.........!''

''یہ میں نے کب کہا بیٹا......... مسلمانوں کو ہندی نہ آتی تو ماسٹر اشفاق حسین، ہندو ماسٹروں کے ہوتے ہوئے، ہندی اور سنسکرت کے اُستاد کیوں ہوتے......... ؟ آپ اگر اپنے دادو سے اُس نالائق لڑکے کا نام پوچھ لیتے جو اپنی کلاس میں ہندی میں سب سے کمزور تھا تو آپ کے لئے آسانی ہو جاتی.........!''

''آئی۔ ایم۔ سوری دادو......... اب بتا دیجئے اُس لڑکے کا نام......... پلیز!''

''نام بتانے کی کیا ضرورت ہے......... وہ نالائق آپ کے سامنے جو بیٹھا ہے......... البتہ! اب اُسے لڑکا کہنا کسی قدر زیادتی ہوگی.........!''

''اوہ نو......... مائی پُور دادو.........!''

''بھئی آگے تو سنو......... ! اِسی پُور دادو کو ماسٹر اشفاق حسین نے، اپنی جیب سے پورا

ایک آنہ یعنی چار پیسے انعام میں دیئے تھے.........پتا ہے کیوں.........؟''

شری مان پردھان ادھیا پک'

فیض عام ہائی سکول'

صدر بازار میرٹھ

سیوا میں سو نیئے نیوے دن یہ ہے کہ پرارتھی کو کل رات سے جوَر آنے کے کارن پاٹھ شالہ میں آنے سے اسمرتھ ہے۔ اتے دو دن کا اوکاش پردان کیا جائے۔ دھنے واد

آپ کا

شُبھ چنتک

بنواری لال

''درخواست کے آخر میں' پرارتھی کے بجائے شُبھ چنتک لکھنے پر کلاس کے بائیس لڑکے' کھسوڑ رہے تھے.........''

''کھسوڑ رہے تھے.........؟''

''کھی کھی کر کے ہنس رہے تھے.........پر نہیں.........بائیسواں لڑکا تو میں خود تھا' اس کا مطلب ہے ہنسنے والے لڑکوں کی تعداد اکیس تھی.........!''

''شُبھ چنتک پر ہنسنے کی کیا تُک تھی بھلا.........!''

''ماسٹر اشفاق حسین کے انوسار' درخواست کے آخر میں درست طور پر 'پرارتھی' لکھنا تھا۔ ماسٹر اشفاق حسین کے خیال میں' میں نے **Creativity** کو کام میں لا کر 'پرارتھی' سے بہتر شبد 'شُبھ چنتک' تحریر کیا تھا۔ اسی بنا پر انہوں نے مجھے انعام کا حقدار ٹھہرایا تھا حالانکہ چند دن پہلے پتا جی کے نام' جبل پور سے لالہ شیو نارائن کی چٹھی آئی تھی جس کے آخر میں لالہ شیو نارائن نے خط کے آخر میں اپنے نام سے پہلے' آپ کا شبھ چنتک تحریر کیا تھا.........میرے دماغ سے عرضی لکھتے وقت 'پرارتھی' گم ہو گیا تھا اور میں نے لالہ شیو نارائن کی نقل میں 'پرارتھی کی جگہ شُبھ چنتک لکھ دیا تھا۔ اس طرح سارے لڑکوں کی کھی کھی کرتی بتیسیاں' ماسٹر اشفاق صاحب کی جانب سے ملنے والے انعام کے بعد شٹر دروازے کی مانند ایک جھٹکے سے گھر رکر کے بند ہو گئی تھیں.........!''

☆

''پھر تو آپ مشکل میں پڑ گئے ہوں گے.........!''

''ایسی ویسی.........!''

''بڑے ابو.........! اُس زمانے میں بھی اتنی بے شرمی تھی جتنی آج ہے.........؟''

''وراثت' روایت' معاشرت کو بے شرمی' بے حیائی یا بد تہذیبی کے پیمانوں سے نہیں ناپا جا سکتا.........ان چیزوں کے باہمی ملاپ سے معاشرے کا رنگ روپ بنتا ہے جسے عرف عام میں ثقافت کہتے ہیں.........''

''اس کا مطلب ہے آپ نے اپنے دوست کے اصرار پر عشقیہ خط تحریر کر دیا تھا.........؟''

''لاکھ سمجھایا.........لاکھ بتلایا.........میں اس معاملے میں قطعی کورا ہوں.........!''

''اس کا مطلب ہے' تیرے ہوتے ہوئے مجھے کوئی اور در کھٹکھٹانا پڑے گا.........! اوئے کچھ تو شرم کر......... تُو میرا کیسا دوست ہے......... دوست کے بُرے وقت میں کام آنے سے انکار کر رہا ہے.........!''

''شرم.........! میں کروں......... شرم تجھے آنی چاہیے.........ہندو دھرم کا ہوتے ہوئے مسلمان لڑکی سے عشق کی پینگیں بڑھا رہا ہے اور ذریعہ ایک مسلمان کو بنا رہا ہے.........؟''

''اچھا.........! اب سمجھا......... لڑائی' دو دوستوں کی نہیں.........اللہ اور بھگوان کی ہے......... لے میرے پیو.........! کان پکڑ کر وعدہ کرتا ہوں جب تُو میرے عشق کا کفارہ ادا کرنے کے لئے کسی ہندو لڑکی سے عشق' محبت' پریم......... جو بھی تیرا جی چاہے کرے گا تو میں تیرا بھرپور ساتھ دے کر اپنے کرموں کا پراشچت کر دوں گا.........اب بھی یقین ہے کہ کھاؤں بھگوان کی سوگندھ.........!''

''پر یار بنتے.........! تیری اُردو تو مجھ سے بہت بہتر ہے......... تو خود ہی تو کہتا ہے کہ تجھے ہندی لکھتے ہوئے بڑی وہ......... چڑھتی ہے.........؟''

''کوڑھ.........!''

''پھر میرے پیچھے کیوں پڑا ہوا ہے.........؟''

''وہ اس لئے میری جان......... ہم پنجابی لوگ اُردو میں پنجابی کی گرائمر شامل کر کے بولتے ہیں......... مثال کے طور پر......... میں اُسے لکھوں گا......... آپ مجھے بہت اچھی لگنے لگی ہیں.........اور تُو لکھے گا......... آپ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں.........میں لکھوں گا......... آپ کے بغیر سب کچھ سُونا سُونا لگنے لگا ہے......... تُو لکھے گا......... آپ کے بغیر سب کچھ سُونا سُونا لگتا ہے.........وغیرہ وغیرہ.........!''

''چچا بقراط.........! جب تجھے اپنی اور میری اُردو کا فرق معلوم ہے تو پھر تیرا مسئلہ کیا ہے.......... تُو خود کیوں نہیں لکھ لیتا.......... کیوں اتنی دیر سے میرا دماغ چاٹ رہا ہے.........؟''

''ویر میرے.........! تیری منت اس لئے کر رہا ہوں کہ تُو خط لکھتے ہوئے......... میر شیر .... غالب شالب کے شعر شور کا تڑکا لگا کر خط کو سوادی بنا سکتا ہے......... اوئے جب میں خط لکھنے بیٹھوں گا تو مجھے تھوڑا پتا چلے گا کہ میں اپنی اُن کو پنجاب کی اردو لکھ رہا ہوں یا یوپی کی.........!''

☆

''پُتر جی.........! وہاں بھی بہتیرے دوست تھے......... فیقا' شیقا' اللہ دوسایا' مہر دین' اوم پرکاش' ٹیک چند اور نہ جانے کتنے......... نائی' دھوبی' ماشکی اور کریانہ والے کے بچوں سے بھی گلی محلے کی حد تک ڈھیر ساری دوستیاں تھیں......... ٹین ایج کی دوستی کی بات ہی اور ہے......... اس عمر کے جذبات ہانڈی میں آنے والے اُبال کی مانند ہوتے ہیں۔ جس کا ذائقہ انوکھا اور دل و دماغ میں چٹکیاں لینے والا ہوتا ہے جسے اُس وقت کے بے تکلف دوستوں' یار' سنگیوں سے ہی کھُل کر شیئر کیا جا سکتا ہے......... یوں سمجھ لو بچپن کی دوستی دودھ کے دانت اور نوجوانی کی دوستی پکے دانت کی مانند ہوتی ہے......... ایک طرح سے دودھ اور شراب کا سا معاملہ بھی کہہ سکتے ہیں......... دودھ خالص ہوتا ہے' صحت بخش ہوتا ہے' لذیذ ہوتا ہے......... اس کے باوجود زیادہ نہیں پیا جا سکتا......... بندہ جلد چھک جاتا ہے......... شراب .... جتنی پیو نشہ اور طلب اُتنی بڑھتی ہے......... دودھ سے جیب میں سواد جب کہ شراب سے ''جی'' میں رچاؤ آتا ہے......... شریفا مِلا بھی مجھے کڑے وقت میں تھا......... ہم آنا تھوڑا چاہتے تھے یہاں......... ہم نے تو پاکستان کے اعلان کے بعد بھی پکا پکا وہیں رہنے کا پروگرام بنا لیا تھا......... آدھے مسلمان تو ہم پہلے ہی تھے......... گوشت کھاتے تھے......... دم' درود کے لئے مسجد اور مزاروں پر جاتے تھے......... دکھ' بیماری میں مولوی' مُلا سے تعویذ گنڈا لیتے تھے......... عید' بقر عید' شبرات اور محرّم میں مسلمان پڑوسیوں اور دوست یاروں سے شِیر و شکر ہو جایا کرتے تھے اور جب بھی محلے میں آواز بلند ہوتی .... ''کُڑیو' جاتکو......... ونڈے دی شے لے جاؤ......... ہر آواز پر دوڑتا ہوا میں باہر گلی اور کبھی کبھی گلی سے بہت دور نکل جاتا......... میرے ماتا' پتا یا خاندان کے کسی بڑے بزرگ نے اس چیز کو کبھی بُرا نہیں سمجھا......... دیوی کے پرشاد کی طرح بڑی عزت اور محبت سے ونڈے کی شے کھائی

جاتی تھی .... سو رگیئے ماتا جی بتاتی تھیں کہ جب میں سال سوا سال کا تھا تو مجھے سوکھیا کی بیماری لگ گئی تھی .... ڈاکٹر کیلاش اور حکیم غلام حیدر کرتار پورے والے کے علاج سے جب کوئی فائدہ نہ ہوا تو ماتا جی مجھے پیپل والی مسجد کے امام مولوی حبیب اللہ کے پاس لے گئیں ....''

''کُڑیئے اے کی تماشا لے آئی اے توں .... نیک بختے توں تے ساڈا دل ای خراب کر دیتا اے .... ہُن دس میں کی کراں ....!''

''مولوی صاب ....! میں کملی کہیہ دس سکنی آں جو کجھ وی کرنا اے ہُن تُساں ای کرنا اے .... میں تے بڑی آس لے کے آئی آں تہاڈے کول ....!''

''دھیئے ....! کرن والی ذات خدا پاک دی اے میں تاں بڑا گنہہ گار بندہ واں .... تو ایس طرح کر' کاکے نوں لے کے کل آئیں تے نال دو تازہ وینگن لیندی آئیں .... رب بھلی کرے گا ....!''

''ماتا جی بتاتی تھیں کہ دوسرے دن مولوی صاحب نے ایک تعویذ گلے میں ڈالنے کے لئے اور ایک پانی میں ملانے کے علاوہ دونوں بینگن دم کر کے دیئے تھے اور ماتا جی کو کہا تھا کہ یہ بینگن کاکے کی منجی کے سرہانے رسی میں باندھ کر کیل پر لٹکا دینا' جوں جوں بینگن سوکھتے جائیں گے ڈوں ڈوں کاکا صحت مند ہوتا جائے گا اور ساتھ ہی مولوی صاحب نے یہ حکم بھی دیا تھا کہ چالیس دن تک ہر روز شام کوفتاں کی نماز کے بعد مسجد سے نکلنے والے نمازیوں سے کاکے کو دم کرایا جائے .... ماتا جی کہتی تھیں کہ بینگن جس تیزی سے سوکھ رہے تھے اُسی تیزی سے میرے ناتواں جسم میں ہوا بھر رہی تھی .... پتہ ہے ....! میں مولوی حبیب اللہ صاحب کے علاج کے باعث دوسرا جنم جی رہا ہوں .... وگرنہ .... حکیموں اور ڈاکٹروں نے تو مجھے لاعلاج بتا کر ہاتھ کھڑے کر دیئے تھے .... ایک مدت تک پتا جی نے' جناح کیپ جست کے پرانے ٹرنک میں چھپائے رکھی .... برسات کے برسات ماتا جی گرم کپڑوں کو ہوا لگواتیں تو پتا جی ٹرنک میں سے جناح کیپ نکال کر سر پر رکھ لیتے اور شیشے کے سامنے کھڑا ہو کر کہتے ....

''ساوتری دیکھ' جناح کیپ پہن کر میں پکا مسلمان لگتا ہوں .... کاش .... ہمارے سیاسی نیتا سوجھ بوجھ کے مالک ہوتے اور فسادات کی آگ نہ بھڑکتی تو آج ہم اپنے پُرکھوں کی ہڈیوں سے بے وفائی کا دکھ نہ بھوگ رہے ہوتے ....''

اصولی طور پر یہاں آ کر مجھے آٹھویں جماعت میں داخل ہونا چاہیے تھا کیونکہ وہاں سے میں ساتویں جماعت کا امتحان دے کر آیا تھا اور سکول کا رزلٹ کارڈ بھی مل گیا تھا جس میں اٹھونجا فیصد

نمبر لے کر پاس ہوا تھا.......... یہاں آ کر مسلمانوں کے سکول میں مجھے داخل کرانے کی یہی وجہ تھی کہ وہاں ہم نے ہندی زبان کی ایک کتاب کے علاوہ سارا کورس اُردو میں پڑھا تھا جس کی وجہ سے میری ہندی بہت کمزور تھی.......... فیض عام سکول کے ہیڈ ماسٹر حفیظ الرحمٰن صاحب نے پتا جی کو مشورہ دیا تھا..........

''آپ کا لڑکا ہندی میں کافی کمزور ہے لہٰذا اسے آٹھویں جماعت کے بجائے دوبارہ ساتویں کلاس میں داخلہ دلائیں' اس طرح تمام مضامین میں محنت کرنے کی بجائے' لڑکا ایک سال ہندی میں محنت کرے گا تو اس کی بنیاد مضبوط ہو جائے گی..........!''

''ہاں بھئی سنا ہے بڑی دور سے کلاس میں نیا مہمان آیا ہے.......... ذرا کھڑا ہو کر اپنا تعارف تو کرائے.......... ''ماسٹر جمعہ بخش کے حکم پر میں کافی نروس ہو گیا تھا.......... مجھے پھر سے مہاجر کیمپ کی یاد آ گئی تھی..........!

''ہاں بھئی کیا نام ہے تمہارا..........؟''

''جی.......... کشوری لال..........!''

''ولد..........؟''

''دھنی رام..........''

''کہاں سے آئے ہو..........؟''

''راولپنڈی سے جی..........''

''پتہ..........؟''

''مکان نمبر **4569** مدن پورہ گوالمنڈی راولپنڈی..........''

''ہیں..........! گوالمنڈی راولپنڈی..........؟ سنا ہے وہاں تو بڑا خون خرابہ ہوا ہے.......... تم کس طرح زندہ بچ آئے..........؟''

''بس جی پرماتما بچانے والا ہے.......... راولپنڈی میں اللہ کا ایک نیک بندہ' میاں حیات بخش بستا ہے.......... انہیں کے دم کرم سے میں اور میرے کئی پڑوسی زندہ سلامت بچ نکلنے میں کامیاب ہو سکے ہیں..........!''

''جی میرا نام بنواری لال ہے.......... میں راولپنڈی' پاکستان سے آیا ہوں..........''

کھردرے لہجے اور پنجابی تلفظ کے باعث لڑکوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے مشکل سے ہنسی ضبط کی..........

''کلاس میں آنے کے بعد کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی.........؟''

''نہیں جی......... کوئی تکلیف نہیں ہوئی ماسٹر صاحب......... شریف الدین میرا دوست بن گیا ہے اور میں اُسی کے ساتھ بیٹھ رہا ہوں......... کلاس کے باقی لڑکے بھی بہت اچھے ہیں.........''

''شریف الدین کے نام پر مت جانا......... یہ ہے بڑا شرارتی.........!''

☆

''اختلافات کی بنیاد کیا تھی.........؟''

''ارے بیٹا......... گڑے مُردے کیوں اُکھاڑتے ہو......... جانے دو' مٹی ڈالو.........!''

''کبھی آپ نوجوان نسل کو عقل مندی' ہوشیاری اور بُردباری کا سرٹیفکٹ دے کر ذمہ دار بنانے کی بات کرتے ہیں.........اور......... کبھی.........؟''

''سرسری نظر سے دیکھیں تو اس لڑائی میں بہت سے عوامل کی کارفرمائی نظر آئے گی......... مثلاً......... نظریاتی بُعد......... معاشی تگ و دو......... معاشرتی تغیر و تبدل......... مسئلہ حقیقت میں انائی تھا......... آپا نے شروع دن سے حاکمانہ مزاج پایا تھا......... اُن کی رائے سے اختلاف ایک طرح سے اُن کے لئے چیلنج ہوا کرتا تھا جسے قبول کر کے' مدمقابل کو ہر قیمت پر زیر کرنا اُن کی اولین خواہش ہوا کرتی تھی......... ہمارے نانا جنگلات ٹھیکے پر لیا کرتے تھے جس کے باعث روپے پیسے کی فراوانی تھی......... آپا چونکہ اُن کی پہلی اولاد تھیں اس لئے اُن کی پرورش میں بیجا ناز و نعم کو کافی دخل......... اوّل تو نانا مرحوم اس رشتے پر تیار نہ تھے کیونکہ شادی کے وقت ہمارے والد صرف ساٹھ روپے ماہوار کے ملازم تھے......... لے دے کے ایک پلس پوائنٹ اُن کی وجاہت اور قدبت تھا جسے ڈھال بنا کر دادی صاحبہ نے ترکش کے تمام تیر آزما کر آپا کا رشتہ حاصل تو کر لیا......... مگر......... سسرال والوں کے سر پر ہمیشہ اُن کی لات رہی۔

''......... میں تو بڑے باپ کی بیٹی ہوں......... جہیز میں چاندی کی اینٹ اور تانبے کے پائے والا پلنگ لے کر آئی ہوں......... میرے برابر کوئی جہیز لا کر تو دکھائے......... میرے ابا تو اس رشتے پر آمادہ ہی نہیں تھے......... میری تو قسمت پھوٹ گئی......... بھلا ساٹھ روپلّی ماہوار میں کبھی کوئی گھر چلا ہے......... سر ڈھکو تو پاؤں ننگے اور پاؤں ڈھکو تو سر ننگا.........'' وغیرہ وغیرہ......... کئی برس تک ابا کے 'لو پروفائل' نے معاملہ نبھائے رکھا......... دادی کے بقول ابا

نے آپا کی دلجوئی اور ناز برداری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جس کے باعث اوائل دنوں میں دونوں میاں بیوی کے درمیان محبت اور گرم جوشی کے آثار بھی نظر آیا کرتے......... ابا جب بھی کانوائے پر دہلی جاتے تو واپسی پر آپا کے لئے کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور لے کر آتے......... آپا بھی آدھی آدھی رات تک دروازے میں کھڑے ہو کر اُن کا انتظار کرتیں اور ابا کے آنے پر دونوں اکٹھے کھانا کھاتے.........

آہستہ آہستہ خاندان میں اضافے اور بڑھتی ہوئی مہنگائی کے باعث تمام محبت و اُنسیت سرد مہری اور تلخی میں تبدیل ہوتی گئی......... تقسیم کے بعد......... ہندوستان......... یا......... پاکستان کے انتخاب کی تکرار وقت گزرنے کے ساتھ شدت اختیار کرتی گئی......... بظاہر ابا نے سیدھا سادا عذر سرکاری ملازمت کا تراش رکھا تھا......... آپا نہ صرف اس دلیل کو بودا قرار دیتیں......... بلکہ .... ابا کی کسی بات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے پر آمادہ ہی نہیں تھیں......... ایک ہی استدلال......... بڑے ماموں کی پاکستان میں خوشحالی اور بار بار کے بلاوے تھے......... ابا کو شروع دن سے، اپنے بزرگوں سے بڑی اُنسیت اور لگاؤ تھا......... وہ کسی قیمت پر اپنے بزرگوں کی قبروں سے بے وفائی کرنا نہ چاہتے تھے......... ہر جمعرات کو باقاعدگی سے آبائی قبرستان جا کر فاتحہ خوانی کرتے اور گورکن کو کچھ نہ کچھ نذر نیاز دے کر خستہ حال قبروں کی صحیح نگہداشت کی تاکید کیا کرتے.........

ایک معقول عذر ابا کے پاس اپنی ضعیف والدہ کی خدمت اور تیمارداری کا بھی تھا......... **1950** میں روز روز کے گھریلو جھگڑوں سے تنگ آ کر، دادی صاحبہ اپنے بڑے بیٹے یعنی ہمارے تایا کے پاس پاکستان روانہ ہو گئیں تو ابا کے مضبوط سائبان میں اک اور بڑا شگاف پڑ گیا جس سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے آپا نے فیصلہ کُن جنگ کا آغاز کر دیا جس میں اُنھیں اپنے منجھلے ماموں یعقوب کی در پردہ اور ہمارے چھوٹے ماموں جمیل کی بھرپور حمایت حاصل تھی .... ابا ہمارے ہوش سنبھالنے کے بعد سے دوپہر کا کھانا نہ کھاتے تھے رات کے باسی سالن سے دو روٹیاں کھا کر چائے کا ایک کپ پیتے اور اس کے بعد پھوارہ چھاپ بیڑی سے جی بہلا کر دفتر چلے جاتے......... چار بجے شام دفتر سے واپسی پر گھر کا سودا سلف لا کر مغرب کی نماز کے بعد رات کا کھانا کھاتے اور پھر مسجد چلے جاتے......... جب سے گھر میں ہندوستان اور پاکستان کے نام پر کھلی جنگ کا آغاز ہوا تھا اُس دن کے بعد سے گھر کا چولہا اکثر ٹھنڈا رہنے لگا تھا......... والدہ کی چڑچڑاہٹ اور غصیلا پن زوروں پر تھا......... میاں، بیوی کے جھگڑوں کا سارا زور اولاد کی مار پیٹ اور جھٹک پٹک پر ٹوٹتا......... آپا کا زیادہ وقت ماموں یا اپنے پیر جی کے پاس حاضری میں گزرتا تھا جس کے باعث گھر کا ماحول

کشیدگی کی انتہاؤں کو چھونے لگا تھا........ کئی بار........ نوبت ہاتھا پائی تک بھی پہنچی........
حالات اس قدر ناگفتہ بہ ہو گئے تھے کہ گھر میں کئی کئی وقت چولہا نہ جلتا اس کے باوجود پونیا لالہ کا قرض بڑھتا جا رہا تھا........ ہم بہن، بھائیوں کو روکھی سوکھی روٹی، باسی سالن یا ستو چاچا، وحید چاچا، تاج بھیا کے گھر سے مانگے کا سالن کھلا کر خاموش کر دیا جاتا........ ابا اکثر راتوں کو چنے کھا کر سو جاتے اور کبھی کبھی ناشتے میں چندی چاچا کی دکان سے، دو پیسے کی چائے اور دو پیسے کا کھاسا لے کر ناشتہ کرتے اور خاموشی سے دفتر چلے جاتے........

ایک دن ابا دفتر سے لوٹے تو گھر کا سامان غائب اور دروازے پر موٹا تالا پڑا ہوا تھا........ آپا گھر کا سارا قیمتی سامان لے کر جو بقول اُن کے انہیں جہیز میں ملا تھا اپنے ماموں کے گھر واقع تلیا محلہ چلی گئی تھیں........ بڑی بہن شاہدہ باجی کی والدہ سے بہت گھُٹتی تھی اور وہ اُن کا کہا بھی مانتی تھیں اس لئے وہ بھی والدہ کے ہمراہ چلی گئی تھیں........ چھوٹا بھائی اسرار شیر خوار تھا اس لئے وہ بھی والدہ کے ہمراہ تھا........ میں اور نجمہ سکول سے واپس آئے تو گھر میں تالا دیکھ کر سیدھے، سُشیل چچا کے گھر والدہ کا پتہ کرنے پہنچ گئے........ سُشیل چچا کی نئی نئی شادی ہوئی تھی اُن کی بیوی ہر وقت شوخ رنگ کی ساڑھی پہنے مانگ میں سیندور اور ماتھے پر بڑی سی بندی لگائے، پیروں میں چاندی کی پازیب پہنے چھن چھن کرتی نظر آیا کرتیں اور سُشیل چچا کی ماتا جی دالان میں پڑے تخت پر، ماتھے پر بل ڈالے بیزاری سے اُنہیں دیکھا کرتیں........ ہمارے استفسار پر سُشیل چچا کی ماتا جی نے ہماری بات کا جواب دینے کے بجائے، ہمارے گھر کی لڑائی کے موضوع پر بے تکان بولنا شروع کر دیا وہ کبھی ابا کو معصوم گرداننے لگتیں اور کبھی آپا کو مظلوم کہنے لگتیں........ سُشیل چچا کی نئی نویلی دلہن نے ہمارے آگے کھانے کی کئی چیزیں رکھیں اُن کے اصرار کے باوجود ہم دونوں بہن بھائی، کچھ بھی ڈھنگ سے نہ کھا سکے بار بار ذہن آپا کی غیر موجودگی اور گھر کے دروازے پر پڑے تالے کی جانب جا رہا تھا........

تین دن بعد آپا کی جانب سے خلع کا نوٹس ملا تو ابا کے اوسان خطا ہو گئے........
گھبراہٹ میں کہتے کچھ تھے، زبان سے کچھ نکلتا تھا........ لے دے کے اُن کے واحد ہمدرد و غمخوار اُستاد عبدالرحمٰن تھے جن کا مختصر رقعہ لے کر شہر کے معروف وکیل تنصیر علی شاہ کے پاس پہنچ گئے........ شاہ صاحب نے نوٹس کا جواب اسلامی شرع کے مطابق تحریر کرایا۔ جس کی رو سے شوہر کی اجازت کے بغیر گھر کی چہار دیواری سے باہر قدم نکالنے والی عورت نکاح سے باہر تصور کی جاتی ہے........ شاہ صاحب نے سات دن کے اندر والدہ صاحبہ کو بمعہ سامان گھر لوٹنے اور شوہر سے

معافی مانگنے کی تاکید کی تھی بصورت دیگر عدالت میں بھاری ہرجانے کا دعویٰ دائر کرنے کی دھمکی دی گئی تھی.........

ابا بتاتے تھے نوٹس وصول کرتے ہی والدہ اور اُن کی ممانی زاروقطار رونے لگی تھیں۔ اُس رات کافی دیر تک اُن کے گھر آنے جانے والوں کا تانتا لگا رہا تھا......... دوسرے دن قریب دو بجے ہمارے گھر جمیل ماموں آئے......... خلاف توقع اُن کا موڈ بہت خوشگوار تھا۔ جس کا ثبوت اُن کی جیب میں بھری ٹافیاں تھیں......... ماموں مجھے اپنے ہمراہ یہ کہہ کر لے گئے کہ آپا کی طبیعت سخت خراب ہے اور وہ مجھے دیکھنے کے لئے بے چین ہیں.........

آپا کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور اُن کی آنکھیں بھی سوجی ہوئی تھیں......... کافی دیر تک وہ مجھے سینے سے لگائے روتی رہیں' بعد میں ابا کی زیادتیوں کا گلہ کر کے اُنہیں بُرا بھلا کہنے لگیں اور میں خاموشی سے سنتا رہا......... کچھ دیر بعد وقفے وقفے سے مجھے کئی بار بازار سے روز مرّہ ضروریات کی اشیا خریدنے کے لئے بھیجا گیا......... بعد از مغرب آپا اپنی خالہ کے گھر مجھے ساتھ لے کر گئیں اور اوپر کی کوٹھی میں کافی دیر تک' اُن کے ساتھ کُھسر پُھسر کرتی رہیں......... میں نے کئی بار' ابا کی پریشانی اور ان کی اجازت کے بغیر آنے کا عذر پیش کر کے' آپا سے اجازت لینے کی کوشش کی......... ہر بار آپا سے زیادہ اُن کی ممانی یہ کہہ کر میرا منہ بند کرا دیتیں.........

''باپ کی اتنی فکر ہے اور ماں مری جا رہی ہے اُس کی کوئی پرواہ نہیں.........!''

کچھ دیر بعد شوربے والے آلو اور چند روٹیاں والدہ کی ممانی نے لا کر ہمارے سامنے رکھ دیں.........

''تم کھاؤ میں ابھی آتی ہوں.........''

آپا پھر سے دوسری کوٹھری میں دروازہ بند کر کے مصروف ہو گئیں......... اتنے میں آپا کے ماموں رکشہ لے کر آ گئے اور یہ کہہ کر مجھے اور اسرار کو آپا کے ساتھ سائیکل رکشہ میں سوار کرا دیا گیا.........

''شرفو بیٹا.........! تمہاری والدہ کی طبیعت زیادہ خراب ہے اور ڈاکٹر ناگن نے دلّی کے لیڈی ریڈنگ ہسپتال میں دکھانے کو کہا ہے جہاں صبح صبح لمبی لائن لگتی ہے تب جا کر نمبر آتا ہے.........''

''مگر میں ابا کو بتا کر نہیں آیا.........؟''

''تم اُس کی فکر نہ کرو میں ابھی تمہارے ابا کو بتا کر آ رہا ہوں انہوں نے خوشی سے تمہیں

والدہ کے ساتھ دلّی جانے کی اجازت دے دی ہے.........!''

میرٹھ سے دلّی تک کے سفر میں میرا دل کافی کُھد بُد کرتا رہا اور جب دلی کے اسٹیشن پر اچانک جمیل ماموں وارد ہوئے اور اُن کے ساتھ شاہدہ باجی کے علاوہ لوہے کا ایک ٹرنک اور کپڑوں کی چھوٹی بڑی پوٹلیاں نظر آئیں تو میرا ماتھا ٹھنکا.........میں نے آپا سے احتجاج کرتے ہوئے حقیقت جاننے کی کوشش کی.........!

''اجی تم بتاتی کیوں نہیں..........ماجرا کیا ہے..........ہم لوگ کہاں جارہے ہیں.........ہاں نہیں تو.........مجھے بچہ سمجھ رکھا ہے.........دسویں میں پڑھتا ہوں.........!''

''اے تو چپکا نی رہ سکتا.........!بڑا آیا دسویں کا فلانا.........ایک رپٹا دوں گا سالے کی کنپٹی پر.........چاروں طبق روشن ہوجاویں گے.........!''

دلّی اسٹیشن کے ویران اور سنسان پلیٹ فارم پر آدھی رات کے قریب ایک ریل گاڑی آ کر لگی جس میں ہماری طرح کے بہت سے ڈرے سہمے خستہ حال لوگ بھاگا دوڑی کرتے ہوئے سوار ہو گئے.........آپا کے ماموں نے ہم پانچوں یعنی آپا' جمیل ماموں' شاہدہ باجی' اسرار اور مجھے ٹرین میں سوار کرایا اور خود کچھ دیر تک پلیٹ فارم پر کھڑے' آپا کے کان میں اُنہیں کچھ سمجھاتے رہے اور پھر اونچی آواز میں مصنوعی طریقے سے اونچا اونچا بولنے لگے.........!

''ہاں ہاں گھبرانے کی کوئی بات نہیں پرسوں تک تو آ ہی جاؤ گے تم لوگ.........فکر کی کوئی بات نہیں' یہاں میں سب کچھ سنبھال لوں گا.........!''

☆

''آہ.........ہا.........انگریزی کے پیریڈ میں فرید کے لمبے بال کھینچتے ہوئے ماسٹر حشمت علی کہہ رہے تھے.........!''

''یورپین چلا گیا' یُوزپین چھوڑ گیا.........کل تک یہ گھنی زلفیں انسانی شکل میں نہ آئیں تو تمہیں بھی سکول آنے کی کوئی ضرورت نہیں.........!''

ماسٹر حشمت علی دھیمے مزاج کے انسان تھے.........خاندانی وجاہت بھی چہرے پر ٹپکتی تھی مگر بات کو کھینچتے بہت لمبا تھے.........خدا جانے فرید کی ابھی اور کتنی شامت آنا تھی' ہاتھ میں نیلے رنگ کا جہازی رجسٹر پکڑے' چچا کالے خان نمودار ہو گئے' پہلے ماسٹر حشمت صاحب سے کسی کاغذ پر دستخط کرائے پھر میری طرف منہ کر کے مخاطب ہوئے.........''

''تمہیں ہیڈ ماسٹر صاحب نے بلایا ہے.........!''

''اُن سے کہنا پیریڈ ختم ہونے میں پانچ منٹ باقی ہیں بنواری لال اُس کے بعد آئے گا.........''

ماسٹر حشمت علی کے حکم پر چچا کالے خان سر ہلاتے ہوئے.........

''جی بہت اچھا.........!''

کہہ کر باہر نکل گئے ساتھ ہی میری ہوا بھی نکال گئے......... پوری کلاس میں' ہیڈ ماسٹر صاحب کو صرف میری یاد کیوں آئی.........؟''

''مے آئی کم اِن سر.........؟''

''ہاں' ہاں آؤ......... تمہارے نام کا وارنٹ آیا ہے پاکستان سے.........' انہوں نے لکھا ہے کہ جلد از جلد تمہیں پاکستان پارسل کر دیا جائے.........!''

''جی سر.........؟''

حلق میں چبھتی خوف کی پھانسوں کو نگلتے ہوئے بمشکل آواز باہر آ سکی.........

''ڈرو نہیں تمہارے کسی عزیز کا پاکستان سے خط آیا ہے.........!''

''میرے عزیز کا......... پاکستان سے.........؟''

''ہاں بھئی اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے......... بھیجنے والے نے صاف صاف لفظوں میں تمہارا نام و پتہ لکھا ہے......... بنواری لال' ولد کشوری لال' کلاس دہم' فیض عام ہائی سکول' صدر بازار میرٹھ' یوپی۔انڈیا......... بھیجنے والے نے اپنا نام پتا لکھا ہوتا تو ابھی معلوم ہو جاتا کہ خط بھیجنے والا کون ہے......... خیر تم گھر جا کر آرام سے پڑھنا اور اپنے والد صاحب کو بھی پڑھوانا شاید یہ انہی کے لئے ہو.........!''

اسکول سے گھر کا فاصلہ چند منٹوں کا تھا جو آج گھنٹوں پر محیط لگ رہا تھا......... طرح طرح کے خیال دل کو ہولا رہے تھے......... پاکستان سے میرے نام کس کا خط آ سکتا ہے......... ہمارے سارے رشتے دار' ہماری طرح شرنارتھی بن کر اِدھر آ گئے ہیں......... ہو سکتا ہے میرے گوالمنڈی والے سکول سے آیا ہو یہ خط......... جس دن پتا جی نے آخری بار مجھے سکول کی فیس دی تھی اُس دن شہر میں ہنگامے ہو گئے تھے اور سکول لگنے کے تھوڑی دیر بعد ہمیں چھٹی دے دی گئی تھی......... میں نے فیس کے پیسے پتا جی کو لوٹانے کے بجائے خود ہی غائب غلہ کر لیئے تھے......... ہو سکتا ہے یہ لالہ لکشمی نارائن کا خط ہو' انہوں نے اپنا اُدھار طلب کرنے کے لئے' میرے نام سکول کے پتے پر ڈالا ہو......... ایک مرتبہ دُرگا پوجا کے لئے ماتا جی نے پیسے دے کر

لکشمی نارائن سے پوجا کا سامان لانے کو کہا تھا' میں نے وہ پیسے گڈی اور پتنا خریدنے پر لگا دیئے تھے بعد میں ماتا جی کا نام لے کر' لالہ لکشمی نارائن سے پوجا کا سامان اُدھار لے آیا تھا......... یہ کس طرح ممکن ہے.........؟ لالہ لکشمی نارائن بھی ہماری طرح ہندو تھا......... ہم تو پھر بھی مسلمانوں سے شیر وشکر تھے لکشمی نارائن تو کٹر ہندو برہمن تھا......... دکان کھولنے سے پہلے اشنان کرتا اُس کے بعد پوجا کے لئے کباڑی بازار کے مندر جاتا' دکان کھول کر چاروں پاسے پوتر جَل کے چھینٹے مارتا اور دیر تک آنکھیں بند کر کے من ہی من میں جاپ کرتا......... اس دوران کوئی گاہک آجاتا تو اشاروں اشاروں میں لکشمی نارائن اُسے ڈانٹ کر سودا دینے سے منع کر دیتا......... بھلا وہ اب تک راولپنڈی میں کیا کر رہا ہوگا......... اچانک میرے ذہن میں ملک منظور کا چہرہ گھوم گیا۔ جس کی سائیکل کی دکان سے میں نے کئی بار کرائے پر سائیکل لے کر چلائی تھی......... ابھی بھی میرے ذمے اُس کے چھ آنے بقایا ہیں......... ہو نہ ہو یہ خط ملک منظور کا ہی ہے......... ملک منظور کو میرے سکول کا پتا کیسے چلا.........؟

''پیارے بنواری لال عرف بنے.........!''

خط کی پیشانی پر اپنا نام اور پیارے پڑھنے کے باوجود دل کی دھونکنی بے حساب دھونک رہی تھی......... من کی تسلی کے لئے بند دروازے پر پھر سے نظر ڈال کر کمرے میں اکیلے پن کا اطمینان کرتے ہوئے منجی پر ڈھیر ہو کر قمیض کے دامن سے ہوا کرتے ہوئے پھر سے خط پڑھنا شروع کیا.........

''پیارے بنواری لال عرف بنے.........!''

سمجھ نہیں آتا.........! تجھے ....اسلام علیکم لکھوں' نمسکار' آداب یا رام رام.........! تُو کہا کرتا تھا کہ تجھے میرٹھ شہر پنجرے کی مانند لگتا ہے جس میں آزاد پنچھی کو قید کر دیا گیا ہے......... سچ مان' تیری بات سُن کر' میں دل ہی دل میں کُڑھتا تھا......... اُٹھتے' بیٹھتے راولپنڈی کے کنوؤں کا میٹھا پانی' کمپنی باغ کی اُجلی صبحیں' دسہرا گراؤنڈ کی ٹھنڈی ہوائیں اور راجہ بازار کی سلونی شامیں یاد کر کے تُو آہیں بھرا کرتا تھا تو میں تجھے عقل سے کھسکا ہوا سمجھ کر خاموش ہو جاتا تھا .... مگر دوست.........! بُرا مت منانا......... قسمت مجھے میرے ارمانوں کی خاک' میرٹھ سے اُڑا کر راولپنڈی لے آئی ہے تو مجھے بھی ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے' پَر کاٹ کر میرے ارمانوں پر لوہے کا کنٹوپ پہنا دیا ہو......... مجھے بھی شدت سے' میرٹھ کی بھینسالی' بیگم پل کی پینٹھ' کوٹھی جنت نشاں' گھنٹہ گھر اور ابّو کا مقبرہ یاد آتے ہیں......... شائد تُو میرے سچ پر' مجھ سے خفا ہو

جائے......... مگر دوست میں اُس وقت تجھ سے خفا نہیں ہوا تھا جب تو میرٹھ کو بے کیف، ویران اور مُردہ شہر کہا کرتا تھا......... میں راولپنڈی شہر کے بارے میں یہ سب تو نہیں کہہ پاؤں گا البتہ.........! اتنا ضرور کہوں گا کہ میں خود تو راولپنڈی پہنچ گیا ہوں، میرے خواب میرٹھ میں بھٹک رہے ہیں.........!''

اِس کے بعد چار صفحے میں دوسرا پورا صفحہ شریفے نے اُس تفصیل سے بھر دیا تھا کہ وہ کس طرح رات کی تاریکی میں اپنی والدہ اور ماموں کے ساتھ، دہلی سے کھوکھرا پار، کراچی، لاہور اور پھر راولپنڈی پہنچا اور کس طرح وہ اپنے والد اور بہن کے لئے تڑپتا اور ہر گھڑی اُن کو یاد کرتا ہے......... تیسرے صفحے پر پہنچ کر شریفے نے پھر سے آپس کی باتیں شروع کر دی تھیں.........!

''یار بنّے.........! یہاں آ کر میں بہت پچھتاتا ہوں کہ میں نے تیرے ساتھ چار سال کی دوستی میں اگر پنجابی کے چند بول سیکھ لئے ہوتے تو مجھے لوگوں کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑتا......... راولپنڈی پہنچنے کے تیسرے روز ہی ماموں نے ملک بنارس کے گھر، مجھے دودھ لینے بھیج دیا......... مجھ سے پہلے بھی وہاں کئی لوگ، رنگ برنگے تہبند باندھے اور شلواریں پہنے دودھ لینے کے انتظار میں کھڑے، پنجابی میں گفتگو کر رہے تھے جس کا ایک لفظ بھی میرے پلّے نہیں پڑ رہا تھا......... میری باری پر ملک بنارس نے، مجھ سے دریافت کیا.........

''کِنا کھڑ سو.........؟''

میں ہونّق بن کر اُس کا منہ دیکھنے لگا......... میری طرف سے جواب نہ پا کر اُس نے پھر دریافت کیا.........

''باؤ جی.........! کِنا کھڑ سو.........؟''

میرے چہرے پر ہوائیاں اُڑتی دیکھ کر، ساتھ کھڑے پکی عمر کے آدمی نے، بائیں ہاتھ کی چھنگلیا میں دبے سگریٹ کا گُل جھاڑتے ہوئے کہا.........!

''ان کا مطبل ہے آپ کو کتنا دودھ چاہیے.........؟''

گو کہ ان صاحب کا لہجہ بھی ایسا تھا جیسے لسی گھوٹ رہے ہوں مگر مفہوم میری سمجھ میں آ چکا تھا......... دو سیر کہہ کر جلدی سے برتن آگے بڑھا دیا.........

دو دن بعد دوپہر کے وقت ممانی نے کہا.........!

''اے بھیا.........! ذرا ہمیں آدھا سیر شلجم تو لا دو......... تمہارے ماموں کو شلجم گوشت بہت پسند ہے.........!''

سبزی والا کچھ دیر تو، حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا پھر ہاتھ کے اشارے سے بائیں گلی میں حکیم کی دکان کا پتا سمجھانے لگا......... میں نے شلجم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا.........!

''حکیم سے کیا کام مجھے تو شلجم چاہیں.........!''

دانتوں میں زبان دباتے ہوئے، سبزی والا پنجابی میں گویا ہوا.........!

''اینج کہو نا.........! ٹھہر جا ہی دے نے......... تسی کہیہ شلجام، شلجام لائی ہوئی اے.........؟''

کل رات کی بات ہے.........! ماموں کے دوست اور کاروباری شریک راجا زمان نے ہم لوگوں کی دعوت کی۔ جانا تو جمیل ماموں کو بھی تھا مگر وہ کاروبار کے سلسلے میں نکاری بازار میں دکان دیکھنے چلے گئے......... ہم لوگ زمان ماموں کے گھر پہنچے تو آپا، شاہدہ باجی اور اسرار زنان خانے میں چلے گئے اور میں زمان صاحب کے ساتھ بیٹھک میں بٹھا دیا گیا......... کچھ دیر بعد زمان صاحب کے ایک دوست راجا مہربان بھی آ گئے جو تفصیل کے ساتھ میرٹھ کے لوگوں کے رہن سہن اور مسلمانوں کے حالات معلوم کرتے رہے......... تھوڑی دیر میں زمان ماموں کا دس بارہ سال کا بیٹا سجاول باری باری چاول، سالن کے ڈونگے اور ڈش کے علاوہ پانی کا جگ، گلاس اور پلیٹیں وغیرہ سینٹر ٹیبل پر سجا چکا تو میزبان نے مجھے کھانا شروع کرنے کی دعوت دی.........!

''شروع کرو بیٹا.........!''

''جی.........!''

کچھ دیر بعد زمان ماموں کے دوست بولے.........!

''دیر کس بات کی ہے......... شروع کیجئے نا.........!''

باری باری دونوں حضرات کی طرف دیکھتے ہوئے، دو مرتبہ میں نے جی جی کہا اور زنان خانے سے کچھ برآمد ہونے کا انتظار کرنے لگا.........!

''بھئی آپ تو بہت شرمیلے ہیں.........!''

میری پلیٹ میں پہلے سادے چاول اور اُس کے اوپر، آلو گوشت کا سالن ڈالتے ہوئے زمان ماموں کے دوست نے میری مشکل آسان کر دی......... وگرنہ میں سالن کے ساتھ کھانے کے لئے روٹیوں کا انتظار ہی کرتا رہتا.........

ابھی بہت ساری باتیں لکھنے والی ہیں جن سے تم میری پریشانی کا اندازہ لگا سکتے ہو.........اب دیکھو اتنی دیر سے اُردو لکھتے ہوئے میری انگلیاں دُکھنے اور دماغ تھکنے لگا

ہے.........میں تمہاری سہولت کے لئے آئندہ بھی تمہیں اردو میں خط لکھتا رہوں گا.........تم بھی میری ہندی کو درست رکھنے کے لئے میرے خط کا جواب ہندی میں تحریر کرنا.........تم اکثر راولپنڈی میں اپنے گھر اور محلے کی بابت بتایا کرتے تھے جسے ہم ہوا میں اُڑا دیا کرتے تھے.........گھر سے دوری کے عذاب نے، تمہارا درد سمجھنے اور محسوس کرنے کے ساتھ اُسے دور کرنے کی تڑپ بھی دل میں پیدا کی ہے.........تم اپنے خط میں میرٹھ کے موجودہ پتے کے ساتھ راولپنڈی میں اپنا سابقہ پتہ ضرور لکھنا.........میں تمہارا کھویا ہوا بچپن تلاش کرنے کی پوری کوشش کروں گا، تم بھی میرٹھ کی گلیوں میں میری نوعمری کو گم نہ ہونے دینا.........اپنی پڑھائی اور کلاس کے تمام دوستوں کی خیریت کی اطلاع ضرور تحریر کرنا.........امتحان نزدیک ہونے کے باعث، مجھے اسکول میں داخلہ نہ مل سکا ہے.........ماموں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں دسویں کا امتحان پرائیویٹ دوں.........ایک ہفتے سے ماسٹر صاحب ٹیوشن پڑھانے آ رہے ہیں.........بظاہر بڑے ہنس مکھ اور لطیفہ گو ہیں مشکور صاحب مگر اُن کے کمزور سینے میں غم کے کئی پہاڑ کھڑے ہیں.........سنا ہے.........!1947 میں ہندوستان سے پاکستان آتے ہوئے اُن کا سارا کنبہ بمعہ اُن کی ایک سالہ بچی کے فسادیوں نے قتل کر دیا تھا......... مشکور صاحب اپنی زبان سے، ایک لفظ بھی اپنے اوپر بیتنے والے ظلم کی بابت بیان نہیں کرتے اگر کوئی ذکر چھیڑے تو صرف اتنا کہتے ہیں.........!''وہ سب جانیں، میرے پاکستان کی امانت تھیں اور پاکستان پر قربان ہو گئیں.........پھر افسوس کس بات کا.........؟''

اتنا کہہ کر مشکور صاحب، دیر تک فضاؤں میں گھورتے رہتے ہیں حتیٰ کہ اُن کے ہاتھ میں لگا سگریٹ جب جلد کو جلانے لگتا ہے تو وہ چونک کر واپس پلٹ آتے ہیں.........بنّے میرے یار.........! مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارا کفارہ ادا نہ کر سکوں گا.........تم اگر چاہو تو میرا قرض ادا کرنے کا ایک طریقہ تمہارے پاس ہے.........میرے والد کو کبھی میری کمی محسوس نہ ہونے دینا اور ہر طرح سے اُن کا اور میری بہن کا خیال رکھنا.........میں جب بھی اپنے پیروں پر کھڑا ہوا تو ضرور اُن کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی کوتاہیوں کی تلافی کروں گا.........اپنی اور اپنے گھر والوں کی خیر خیریت تفصیل سے لکھنا.........اور اُن کی بھی.........؟

راولپنڈی میں میرا پتہ یہ ہے مکان نمبر P/730، مائی ویرو کی بنی، راولپنڈی پاکستان

تمہارا اپنا

شریف الدین

☆

ہاں........ہاں کیوں نہیں........! کھسر پھسر اور خفیہ میٹنگ کے بعد سب کا خیال تھا کہ یہ خط ابا نے بھیجا ہے........ جو مجھے ورغلا کر واپس بُلانا چاہتے ہیں........ خط کو پڑھنے اور اُس کے ایک ایک مندرجات پر غور کرنے کے بعد بھی خط کے پیچھے ابا کی کارفرمائی تلاش کی جاتی رہی........!

''سنو........! یہ بنواری لال کون ہے........؟'' آپا نے چبھتی نظر سے میرا جائزہ لیتے ہوئے دریافت کیا۔

''میرا دوست ہے........ یہیں کا رہنے والا ہے۔ **1947** میں مہاجر بن کر گئے ہیں یہ لوگ........ فیض عام سکول میں ساتویں سے دسویں تک ہم دونوں ساتھ تھے........ بڑا گہرا دوست بن گیا تھا میرا........ چار سال تک ہم لوگ چاروں کلاسوں میں ایک ساتھ ہی بیٹھتے تھے........ آپ بھول گئیں یہ وہ ہی بنواری لال ہے جب ابا نے آٹھویں کلاس میں بورڈ کا امتحان دینے کے بعد، رزلٹ آنے سے پہلے ہی مجھے سلائی مشینوں کے کام پر ڈال دیا تھا۔ یہ باقاعدہ ابا سے آ کر لڑا تھا اور جب ابا نے اس کی بات نہیں مانی تو وہ سیدھا ماسٹر اشفاق حسین کے پاس چلا گیا تھا........ ابا کی نسبت ماسٹر اشفاق حسین کو اس بات پر قائل کرنا آسان تھا کہ ایک لائق لڑکے کو پڑھائی سے اُٹھا کر کام پر لگانا غلط بات ہے........ بنواری لال ابا کے آگے بے بس تھا اور ابا ماسٹر اشفاق حسین کے آگے نہ بول سکے........ ماسٹر اشفاق حسین نے ابا کی جانب سے اخراجات کا عذر پیش کرنے پر، میری پڑھائی کا سارا خرچ اپنے ذمّے لینے کی آفر کی تو ابا پر گھڑوں پانی پڑ گیا جس کے بعد میری پڑھائی کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا تھا........!''

''اچھا........ اچھا یہ مٹھی والا تو نہیں........؟''

''آپا........! مٹھی نہیں........ مٹھی........ آپ نے تو کمال کر دیا، میں جب پہلی مرتبہ اُس کے گھر گیا تھا تو مٹھی کو میٹھی کہہ رہا تھا جس پر بنّے نے میرا تلفظ صحیح کرتے ہوئے کہا تھا........!''

''بھولے بادشاہ........! یہ میٹھی نہیں نمکین ہے........ جس طرح آپ لوگ شام کی چائے یا مہمان نوازی میں نمک پارے استعمال کرتے ہو اسی طرح پنجاب کے لوگ، مہمان داری اور شام کی چائے میں اسے شوق سے کھاتے ہیں........ بزرگ اور بیمار لوگ جو صُبح کے ناشتے میں لسی وغیرہ نہیں پیتے اور ہلکا ناشتہ کرنا چاہتے ہیں وہ بھی اسے شوق سے کھاتے ہیں........ تم لوگ نمک پارے کے میدے کو سیدھا سیدھا نمک والے پانی میں گوندھ لیتے ہو جب کہ ہم لوگ مٹھی کے میدے میں، سفید زیرا، نمک اور دودھ، الائچی ملا کر گوندھتے ہیں۔ جس سے اس کا سواد چنگ جاتا

ہے........!"

"اچھا اچھا........ جو بھی ہے مُٹھی، مُٹھی یا میٹھی........ ہمیں کیا لینا ہے تم یہ خط لو، لمبی چوڑی دوستی یا خط و کتابت کی ضرورت نہیں .... ویسے بھی ہمارا اب انڈیا سے کیا تعلق........ ختم کرو یہ چونچلے بازی........!" آپا کی سنگدلی پر بہت سے تیز دھار جملے زبان کی نوک پر مچلنے لگے........ میرے لئے خاموشی کی چادر میں منہ لپیٹنا ہی مناسب تھا۔ کیوں کہ ابھی تک بنواری لال کا خط آپا کے ہاتھوں کی گرفت میں پھڑ پھڑا رہا تھا........!

بے شرم........ بے مروت........ بے وفا........!

رام رام........ سلام........ آداب........ یا نمسکار لکھنے سے کچھ فرق نہیں پڑتا........ فرق پڑتا ہے بندے کی سوچ سے........ اُس کے کرموں سے........ سمجھ نہیں آتا تیری جُدائی کو کیا نام دوں........ تجھے کس القاب سے پکاروں........ بھائی کہوں یا دوست........ اپنا کہوں یا بیگانہ........! تیرا خط ملنے کے بعد سے میرے اوپر بڑی عجیب کیفیت طاری ہے۔ کبھی پسلی سے خوشی کی لہر اُٹھتی ہے اور کبھی پسلی پر جا کر درد کی ٹیس میں تبدیل ہو جاتی ہے........ جانے کے بعد تُو نے مجھے یاد رکھا، اپنے دکھ سکھ میں شریک کیا۔ اس سے میرا سینہ اور بھی چوڑا ہو گیا ہے.......... تُو مسلمان ہے.......... تیری تمناؤں کا مرکز کعبہ اور مدینہ ہے........ میں تو ہندو دھرم سے تعلق رکھتا ہوں........ میرا کعبہ اور مدینہ تو وہیں ہے جہاں تُو اب جا پہنچا ہے.......... یہی سوچ کر میرے خون میں خوشی کے اُبالے پڑنے لگے ہیں........ ہمارے پنجاب میں........ عورتیں دو پٹہ وٹ بہنیں اور مرد صافہ بدل بھائی بنتے تھے........ قدرت نے ہم دونوں کو شہر وٹ بھرا بنا دیا ہے........ آج سے پہلے تُو میرا یار تھا........ آج کے بعد تُو میرا بھائی ہے........ شہر بدل بھائی........ ماں جائے سے بڑھ کر سگا اور عزیز........!

اور یہ تُو زبان کے اُلٹ پھیر سے جی ہولا نہ کرنا........ زبان کا کیا ہے یہ تو ویسے بھی تِلک جاتی ہے........ پچھلے ہفتے یہاں بارشوں کا بڑا زور تھا........ ہمارے ساتھ والوں کی چھت اور ہماری چھت کا پانی ایک ہی نالی سے گزرتا ہے جس کا راستہ ساتھ والوں کی طرف ہے........ جب ہماری چھت پر بہت سا پانی کھڑا ہو گیا تو پتا جی نے ساتھ والوں کا دروازہ کھٹکھٹا کر پانی کی بابت بتایا........ کافی دیر تک دونوں بندے ایک ساتھ بولتے رہے پھر پتا جی کی اونچی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی........!

''شاہ صاحب! آپ نے جو عرض کی وہ میں نے سُن لی ہے جو کچھ میں فرما رہا ہوں وہ بھی تو سُنیں........ پرنالے کا رُخ آپ کی چھت پر ہے یا تو آپ اُس کی صفائی کا ذمہ نبھائیں یا ہمیں حکم کریں کہ آپ کی چھت پر آ کر بند پرنالے کو کھولیں.........!''

گفتگو کے آغاز میں شاہ صاحب پٹھے پر ہاتھ ہی نہ رکھنے دیتے تھے.........پتا جی کی گفتگو سُن کر ان کے ماتھے کے بَل بھی دُور ہو گئے اور وہ مسکراتے ہوئے یہ کہہ کر اپنے گھر میں داخل ہو گئے.........

''اچھا' اچھا جیسے آپ فرمائیں گے ویسا ہی ہوگا.........!''

اور ہاں ایک بات پلّے باندھ لے' پنجابی زبان کو مشکل یا بیگانی بولی سمجھ کر گھبرائیں نا.........! یہ بڑی میٹھی اور سوادی زبان ہے.........بندہ اس میں جتنا کُھبتا جاتا ہے اُتنی ہی یہ بندے کے اندر رچتی جاتی ہے.........ماں کی محبت کی طرح کبھی نہ ختم ہونے والی.........تُو اِس طرح کر' روزانہ پنجابی کے دو چار اکھٹ بول......... میرا مطلب ہے سخت الفاظ کی' تنہائی میں مشق کیا کر .... جس طرح میں.........ہسپ تال کو ہسپتال .... گو... شت کو گوشت ....چول کو چاول اور مجھ کو پھینس اور اب بھینس کرنے پر لگا ہوں اسی طرح تُو بھی .... آپ' جناب کو کم کر کے .... اُسی' تُسی شروع کر دے.........اور یاد رکھنا ....! پنجابی لوگ پیٹ کو ٹڈھ کہتے ہیں جب کہ غیر پنجابی اس کو ڈِڈھ کے تلفظ سے خارج کرتے ہیں......... تمہارے یا آپ کے لئے تہاڈا استعمال ہوتا ہے جب کہ غیر پنجابی تاڈا بول جاتے ہیں.........یوں سمجھ لے.........! معاملہ' دل اور دماغ کا ہے.........اردو' دماغ اور پنجابی دل کی زبان ہے.........دل کے معاملہ میں......... تھوڑا بہت ہیر پھیر تو ویسے بھی جائز ہے.........! تُو فکر نہ کر اگلے خط میں پنجابی کے بہت سے مشکل الفاظ اور اُن کا صحیح تلفظ لکھ کر میں تجھے بھیج دوں گا' اِس طرح تیرا وہ قرض کچھ کم ہو جائے گا جو تُو چار سال تک میری اردو ٹھیک کرنے پر لگا رہا تھا.........

اور ہاں.........! ہر اتوار کو ٹھرک پوری کرنے کے لئے سورج کنڈ جاتا ہوں اور شمشان گھاٹ کی سامنے والی سیڑھی پر بیٹھ کر پانی کا نظارہ کر کے لوٹ آتا ہوں' تیرے بغیر پانی میں چھال مارنے کو دل نہیں کرتا......... مَن میں عجب طرح کا ہول آتا ہے......... پچھلے اتوار ایک اور گڑ بڑ ہو گئی......... میں شمشان گھاٹ کی سیڑھیوں پر بیٹھا من ہی من میں تجھے یاد کر رہا تھا اور سیڑھیوں پر پڑی کنکریوں سے کھیل رہا تھا' جب پانی میں ایک کنکری پھینک کر میں نے اپنا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی......... تو جانتا ہے کیا ہوا......... بجائے میرے' پانی پر تیری شکل نمودار ہو گئی.........میں

نے جتنی بار بھی پانی میں کنکری پھینک کر اپنی شکل دیکھنے کی کوشش کی اُتنی ہی بار میرے بجائے تیری شکل نمودار ہوتی رہی......... سورج کنڈ سے واپسی پر چنڈی کے مندر اور بالے میاں کے مزار پر بھی باقاعدگی سے جاتا ہوں مگر مزار کے اندر جانے کی ہمت نہیں پڑتی......... کیا پتہ کوئی مسلمان مجھے پہچان کر ہنگامہ کھڑا کر دے کہ ہندوؤں کا لڑکا مسلمانوں کے مزار پر کیا لینے آیا ہے' اور ہاں یار.........! میں جب بھی چنڈی کے مندر میں جاتا ہوں' پھول اور پرساد کے بیچ پڑے سکّے میرا منہ چڑا رہے ہوتے ہیں مگر اُنھیں چُرانے کی ہمت نہیں ہوتی......... جب بھی ہاتھ بڑھاتا ہوں ایک انجانا سا خوف' من کو ہولا دیتا ہے......... ویسے یار ایک بات ہے جس طرح سیاست کے گورکھ دھندے ہماری سمجھ میں نہیں آتے اِسی طرح مُلّا اور پنڈت کے دعوؤں میں بھی بڑا جھول دکھائی دیتا ہے......... دیکھنا.........! مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ بالے میاں نے چنڈی کو زیر کر لیا تھا جب کہ ہندو' بالے میاں کی ہار کا ڈھونڈرا پیٹتے ہیں......... مگر......... دونوں طرف کے سادہ دل بندے اپنی اپنی بات پر شدت سے ڈٹے ہوئے ہیں......... نہ چنڈی کے مندر کی رونق کم ہوئی اور نہ بالے میاں کے مزار پر رش کم ہوا' اور ہاں یار.........! میں تو یہ سوچ کر ہول رہا ہوں کہ تیرے بغیر نوچندی کے میلے میں ہلّے گُلّے کا مزہ کیسے آئے گا.........؟ یاد ہے پچھلی مرتبہ ہم لوگوں نے اصغر علی کو ایک چالیس پنتالیس سالہ عورت کے پیچھے یہ کہہ کر لگا دیا تھا کہ یہ تجھے غور سے دیکھ رہی ہے......... کافی دیر تک اصغر علی اُس عورت کے آگے پیچھے گھومتا رہا......... بریلی کے سُرمہ والے مرزا جی کی دکان پر اُس عورت سے نہ رہا گیا.........! نقاب پلٹ کر بولی.........!

''کیوں بیٹا......... کیا بات ہے تجھے کوئی کام ہے مجھ سے.........؟''

اصغر علی ہونق بن کر کہہ بیٹھا!

''جی.........! سُرمہ لینا ہے مجھے.........!''

''سُرمہ لینا ہے تو اِدھر آؤ برخوردار.........!''

مرزا جی نے کتنی بدمعاشی سے آنکھیں مٹکاتے ہوئے نہ صرف اصغر علی کو قریب بُلایا بلکہ آنکھیں دیکھنے کے بہانے اُس کے چکنے گالوں پر بھی خوب ہاتھ پھیرے......... اللہ توبہ اصغر علی نے کتنی غلیظ گالیاں بکی تھیں ہم سب کو اور ہمیشہ کے لئے دوستی توڑنے کا اعلان بھی کر دیا تھا اور جب دوسرے دن ہم سب اُسے منانے گئے تو وہ فوراً مان گیا......... اور اُس دن میلے میں دو بوڑھی عورتوں کے درمیان گاڑھے میک اپ میں چنک مٹک کرتی ایک لڑکی کا پیچھا کرتے ہوئے ہم اُس کے گھر تک پہنچے تو وہ اصغر علی کے محلے کی دھوبن نکلی جس پر اصغر علی نے ہمارا خوب مذاق اُڑایا اور پچھلے

دن کا اپنا قرضہ برابر کیا۔

یار شریفے.........! تیرے جانے کے بعد سے رادھا کی چاٹ کھانے کو دل ہوا، نہ شنکر کا پان اور نہ بشیر بھٹیارے کے پائے کھانے کی ہمت ہوئی اور ہاں احمد سلام، اصغر علی، دلشاد عالم، وجے کمار، عابد حبیب، افضال احمد، نعیم الرحمٰن اور سلیم الدین کے علاوہ ماسٹر اشفاق حُسین تجھے بہت یاد کرتے ہیں......... اگلے خط میں تُو ان سب کے نام دعا سلام ضرور لکھنا، میں تیرا خط لیجا کر انہیں دکھاؤں گا تو وہ سب بہت خوش ہوں گے......... اس بار، میں زبانی ہی یہ کام کر دوں گا، اور ہاں.........! ایک کام تیرے ذمے لگا رہا ہوں چٹیاں ہٹیاں محلے میں پیپل والی مسجد کے امام صاحب مولوی حبیب اللہ کی خدمت میں میرا اور میرے گھر والوں کا سلام پہنچانا اور کہنا کہ میں کوفتاں کی نماز کے بعد دم کرانے تو نہیں آ سکتا مگر اُن کی دعاؤں کی ہمیں اب بھی اُتنی ہی ضرورت ہے جتنی وہاں رہتے ہوئے ہوتی تھی اور سُن ورزش کا شوق پورا کرنا ہو تو کمپنی باغ کے اکھاڑے میں ضرور جائیں......... وہاں میراں بخش پہلوان ہوں گے......... مجھے وہ نہیں پہچانتے، میرے پتا جی کا نام لے کر اُن کی خدمت میں پتا جی کا سلام ضرور پہنچانا......... اور یار شریفے.........! ملک منظور سائیکل والے سے بھی ملاقات کر لے تو تیری بڑی مہربانی ہے......... گوالمنڈی میں کمہار روڈ کے نکڑ پر دکان ہے......... اوّل تو ملک منظور نے، میرے ذمے واجب، پیسے معاف کر دیئے ہوں گے......... نہیں تو میرا یہ قرض بھی تُو نے چکانا ہے.........!

یار شریفے.........! اتنا لمبا خط لکھنے کے بعد بھی، سر پر باتوں کی پوٹلی کا وزن جوں کا توں برقرار ہے......... اس وزن کو خوشی خوشی میں اُس وقت تک اٹھائے پھروں گا جب تک تجھے دوسرا، تیسرا، نہ جانے کتنے خط لکھتا رہوں گا......... تُو نے اپنے والد صاحب اور ہمشیرہ کی بابت توجہ دلا کر، مجھے شرمندہ کر دیا ہے......... آئندہ کبھی اس قسم کی بات نہ لکھنا......... وہ صرف تیرے نہیں میرے بھی پِتا ہیں اور تیری بہن میری دیدی سمان ہیں مجھ سے جو بھی بَن پڑا میں کرتا رہوں گا.........

تیرا اپنا

بنواری لال

☆

ارے بیٹا.........! آپ میں ہمت ہے نہ مجھ میں تاب.........! گنتی اور حساب میرا ویسے بھی کمزور ہے.........وزن میں پوچھو تو بے حساب......... گنتی میں پوچھو تو

لاتعداد........ آخری خط اُس کا دستی آیا تھا........ پاکستان سے آنے والے ایک صاحب لائے تھے........ اُن دنوں آپ کے دادا جی بہت بیمار تھے........ شریر کے روگ اور وطن سے دوری کے علاوہ شریفے کے خط میں اپنے آبائی مکان کی ٹوٹ پھوٹ اور خستہ حالی کی خبر سنتے ہی اُن پر غشی کے دورے پڑنے لگے تھے........

''پُتر وے........! اپنے دوست شریفے کو لکھ........ ہتھ باندھ کے اُس سے بنتی کر کہ وہ میرے جسم پر لگے زخموں کا کچھ علاج کرے........!

''اُسے لکھنے کی کیا لوڑ ہے پِتا جی........! میں ہوں نا آپ کی سیوا کے لئے........ آپ حکم کریں........!''

''نہیں........ پُتر........ نہیں! میرے زخموں کا علاج تیرے بس میں نہیں' پتہ ہے........! تیرے دادا جی نے کتنے کشٹ جھیل کر اور کتنے سُفنے سجا کر بنایا تھا وہ گھر........ اُسے گرنا نہیں چاہیے پُتر........ اُس کے گرنے سے' ہمارے ارمان' ہمارے سُفنے سڑھ کے سَوا ہو جائیں گے........ تُو نہیں دیکھ سکتا........ کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا........ میں اپنے جسم پر اُتنے ہی پھٹ محسوس کر رہا ہوں جتنے میرے گھر کی دیواروں پر پڑے ہوں گے........ ہنے اوئے........! وہ ہمارا گھر ہی نہیں' ماتا کا پوتر استھان بھی ہے........ میں تیری دادی کو' پرلوک میں جا کر کیا منہ دکھاؤں گا........ وہ مجھ سے پوچھے گی کہ میں نے ماتا کے پوتر استھان کی رکھشا کے لئے اپنا دھرم نبھایا کہ نہیں تو میں کیا جواب دوں گا........؟''

میرے خط کے جواب میں شریفے نے پاکستان' راولپنڈی سے آنے والے حکیم مرزا فیروز الدین کے ہاتھ' پِتا جی کی صحت یابی کی دعائیں اور نیک تمناؤں کے علاوہ مولوی حبیب اللہ کے تحریر کردہ تعویذ' پڑھا ہوا پانی اور سرکار بری امام کے تبرّک کے علاوہ بادام روغن ومنقا کی سوغات بھی بھیجی تھی اور ساتھ ہی یہ خوشخبری بھی سنائی تھی کہ اُس نے ہمارے راولپنڈی' مدن پورہ والے گھر کے مکینوں کو' پِتا جی پر گزرنے والی بِپتا سنائی تو وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے اور دلّی کے کرول باغ میں' اپنا سجا سجایا گھر چھوڑنے کی داستان ہچکیوں میں بیان کرنے لگے........ کس طرح پنڈت اوماشنکر کے ایثار اور قربانی کے باعث وہ اپنی اور اپنے بچوں کی جانیں بچانے میں کامیاب ہوئے تھے........ انہوں نے جلد ہی کلیم کی منظوری کی نوید سناتے ہوئے' ہمارے مکان کو اپنے نام الاٹ کرانے اور اُس کی مرمّت ورنگ وروغن کا پکّا وعدہ کیا تھا اور پِتا جی کے نام تحریر کردہ رقعے میں اُنہیں راولپنڈی آ کر اپنے مکان میں قیام کی دعوت بھی دی گئی تھی........!

☆

''آپ نے اُن کے والد کے لئے اتنا کچھ کیا........انہوں نے' آپ کے ابّو کے لئے بھی کچھ کیا کہ نہیں.........؟''

''ہائے ہائے بیٹا..........! کیا سوال کر ڈالا..........میرے جگر کے ٹکڑوں.........! اُس نے تو اتنا کچھ کیا کہ میں ساری عمر بھی اُس کی غلامی کروں تو اُس کا قرض نہیں چکا سکتا.........

اُنہیں دنوں آپا کی ممانی بانو پاکستان آئیں تو آپا نے گھنٹوں اُن سے اپنے شہر' محلّہ اور عزیزوں کی بابت دریافت کیا۔ ابّا اور نجمہ کے ذکر پر آپا کی ممانی جذباتی ہو کر بولیں.........!

''بھئی وہ کیا نام ہے.........؟ وہ تمہارے لڑکے کا ہندو دست ہے نا.........! بڑا خیال رکھتا ہے تمہارے شوہر اور بیٹی کا.........ہولی' دیوالی کے علاوہ عید' بقر عید پر باقاعدگی سے لین دین کرتا ہے اور ہر دکھ سُکھ میں ایک ٹانگ پر کھڑا رہتا ہے.........ایک مرتبہ تو وہ اُن کی خاطر پڑوسیوں سے لڑ کر تھانے بھی جا پہنچا تھا.........!''

☆

''آپ لوگ ایک دوسرے سے اتنی محبت کرتے تھے تو خط و کتابت کیوں بند ہو گئی.........؟''

''آہ.........ہا.........پہل میری طرف سے ہوئی تھی.........! مرزا فیروز الدین کے ہاتھ بھیجے گئے جواب میں اپنی سرکاری نوکری کی اطلاع کے ساتھ میں نے اُسے آئندہ بذریعہ ڈاک خط نہ لکھنے کی معذرت کی تھی کیونکہ سرکاری ملازمت کے دوران پاکستان سے خط و کتابت میرے لئے مشکلات پیدا کر سکتی تھی.........!''

☆

''اُس خط کے جواب میں آپ نے کیا کیا.........؟''

''کرنا کیا تھا..........! اُس کے خط سے میرے دل کا بوجھ کسی قدر کم ہو گیا تھا.........سی۔ایس۔ایس کا امتحان پاس کرنے کے بعد میرے لئے ضروری تھا کہ میں خود کو سچّا پاکستانی ثابت کروں لٰہذا میں پہلے ہی وہ تمام خط نذرِ آتش کر چکا تھا جو اِس عرصے میں بنواری لال نے لکھے تھے.........کئی بار آئے گئے لوگوں کے ہمراہ بنواری لال نے سوغات کے طور پر نوچندی کے اچار اور پانی کے بڑے' پانو کی ڈھولی اور بالے میاں کے مزار کی شیرنی ارسال کی.........جواب میں'

میں بھی کابل کا گرما' ہینگ' منقا اور بادام روغن وغیرہ کے تحفے ارسال کرتا رہا......... آہستہ آہستہ یہ سلسلہ بھی کمزور ہوتے ہوتے نہ ہونے کے برابر رہ گیا........!''

☆

''پاپا........! آپ ہر روز سادہ ناشتہ کرتے ہیں پھر بھی ہر روز یہ ضرور پوچھتے ہیں........ بھئی ناشتے میں کیا بنا ہے........؟''

''ایک آدمی نماز پڑھتا تھا نہ روزے رکھتا تھا........ نذر نیاز شوق سے کھاتے ہوئے کوئی شخص اُسے ٹوکتا تو وہ کہتا........!''

''کیا چاہتے ہو تم..........؟ نذر نیاز بھی نہ کھاؤں.......... بالکل کافر ہو جاؤں........!'' سوال کرنے والے کا منہ منطقی جواب سے بند کرتے ہوئے وہ شخص اپنے کام میں اور تیزی سے مصروف ہو جاتا........ مجھے پتا ہے ڈاکٹروں نے میری مشکلیں کسی ہوئی ہیں........ دو سلائس براؤن بریڈ' آدھا گلاس موسمی یا سنگترے کا جوس اور ایک کپ شوگر کے بغیر کافی' میرا روز کا ناشتہ ہے مگر بیٹا........! انڈوں کا آملیٹ' چیز' بٹر' مالیٹ' دودھ وغیرہ کے ذکر سے ذہنی لُطف' میرا مطلب ہے مزہ تو لیا جا سکتا ہے........!''

''آل رائٹ .... آل رائٹ........ آپ جو کہہ رہے ہیں وہ بالکل ٹھیک ہے........ اب اپنا اخبار لے کر آ جایئے اور چٹ پٹی خبروں کے ساتھ' سمپل بریک فاسٹ کر لیجئے........!''

''ہاں بھئی........! ویسٹ میں' اخبار انفارمیشن کے لئے چھپتے ہیں اور تھرڈ ورلڈ میں انٹرٹینمنٹ کے لئے........ چلو دیکھتے ہیں' آج کیا خبریں ہیں........ اوہ نو........ انسانیت کے دشمنوں کچھ تو خدا کا خوف کرو........!''

''واٹ ہیپن پپا........؟''

''بھارت کے پرتھوی میزائل کے جواب میں پاکستان نے غوری میزائل تیار کر لیا........!''

''اِٹس ویری بیڈ........!''

''بہار کے چیف منسٹر لالو پرشاد یادیو نے' ڈس کوالیفیکیشن کے بعد اپنی انگوٹھا چھاپ پتنی' رابڑی دیوی کو چیف منسٹر نومی نیٹ کر دیا........!''

''انٹرسٹنگ........!''

''امیتابھ بچن نے ڈھائی کروڑ میں فلم سائن کر کے، ریکارڈ قائم کر دیا.........!''

''ویری فنی......... آئی لائک بگ بی.........!''

''ہیں.........! یہ میں کیا پڑھ رہا ہوں......... نو......... نیور......... یہ کس طرح ہو گیا؟......... شیکھر کو بلاؤ......... جلدی سے شیکھر کو بلاؤ.........!''

''پپا.........! آر یو او کے.........؟''

''نہیں......... بہت گڑ بڑ ہو گئی ہے......... مجھے فوراً میرٹھ پہنچنا ہے......... آج کل اتنا ٹریفک ہے کہ دہلی سے میرٹھ پہنچنے میں دو گھنٹے لگ جاتے ہیں......... ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے......... کوئیک......... میں کپڑے تبدیل کر کے آتا ہوں.........!''

☆

کارڈ پر لکھی عبارت کو دہراتے ہوئے ایس۔ ایس۔ پی پولیس نے کھڑے ہو کر سیلوٹ کیا اور احترام سے کُرسی پیش کرتے ہوئے بولا.........!

''سر.........! آپ نے کیوں کشٹ کیا.........؟ آپ آدیش کرتے، میں خود چل کر آپ کی سیوا میں اُپس تھت ہو جاتا.........!''

''سُنا ہے.........! تم نے کسی اُگروادی کو گرفتار کیا ہے.........؟''

''جی سر.........! ٹھیک سُنا ہے آپ نے.........بہت خطرناک آدمی ہے سر......... سٹی کے ویزے پر کینٹ میں گھوم پھر رہا تھا.........!''

''صرف یہی جرم ہے اُس کا.........؟''

''نہیں سر.........! پوچھ تاچھ کے دوران پتا چلا ہے، وہ پاکستان کا ریٹائرڈ سرکاری ملازم ہے......... پاسپورٹ میں، جعل سازی کر کے بزنس مین لکھوالیا ہے، سر.........! میرا خیال ہے وہ کسی خاص مقصد سے آیا ہے ہمارے دیش میں.........؟''

''فضول باتیں مت کرو......... یہ کاغذات لو اور اُسے جلد رہا کرو.........!''

''سر آپ.........؟ ایک اُگروادی کی ضمانت دے رہے ہیں......... وہ بھی پاکستانی.........!''

''کاش.........! تمہاری باہر کی آنکھ کے علاوہ اندر کی آنکھ بھی کھلی ہوتی......... بے وقوف انسان.........! اُگروادی وہ نہیں......... اُگروادی تمہارے سامنے کھڑا ہے......... جو، پنسٹھ سال کا بھارتی ناگرگ ہونے اور چالیس سال تک ہندوستانی پولیس کی نوکری کرنے کے بعد

بھی........ پاکستان کا درد' سینے میں پالے ہوئے ہے........ ہندوستان پولیس کا یہ ریٹائرڈ آئی جی' آج اگر زندہ ہے تو صرف پاکستان کی دھرتی........ راولپنڈی کی مٹی کو چومنے کی آس میں........ جہاں اِس کا جنم ہوا تھا........ جسے یہ اپنا کعبہ اور مدینہ سمجھتا ہے........ لو........! گرفتار کرو اِس اُگروادی کو........ اگر تم اِس اُگروادی کو گرفتار نہیں کر سکتے تو تمہیں یہ حق کس نے دیا ہے کہ تم ایک مجبور بے بس شخص کو اِس بنا پر گرفتار کرو کہ اُس نے اپنے کعبۂ ثانی کی زیارت کے لئے' ایک معصوم سا جھوٹ بولا ہے........ کم عقل انسان........! وہ اُگروادی نہیں........ وہ تو شُبھ چنتک ہے........ تیرا بھی........ میرا بھی........ اور اس دھرتی کا بھی........!

☆

دوسرے دن کے اخبارات نے' ایک خبر کو دو حصوں میں بانٹ کر چھاپا........ ایک اُگروادی جس کا سمبندھ پاکستان سے تھا........ پولیس کسٹڈی میں مُردہ پایا گیا........ اُتّر پردیش پولیس کے پُورو آئی' جی پولیس بنواری لال چوہان کا میرٹھ شہر کی کوتوالی میں دل کا دورہ پڑنے سے دیہانت ہو گیا........!

ایک ارتھی ''رام نام ست ہے'' کے جاپ میں چنڈی کے مندر سے........ دوسرا جنازہ ''کلمہ شہادت اشھد اللہ لا الہ الا الہ'' کے وِرد میں بالے میاں کے مزار سے' ایک ساتھ اُٹھ رہے تھے........ دنیا کی ایک چوتھائی آبادی میں کوئی شخص بھی یہ نہیں جانتا تھا........! آج سے ڈیڑھ سو سال قبل' اسی سرزمین پر دو بہادر اور جری نوجوان بھائیوں........ منگل سنگھ پانڈے اور دیش سنگھ پانڈے نے........ فسطائی ہتھیاروں کو' انسانی عظمت کے لئے للکارتے ہوئے........ جام شہادت نوش کیا تھا........ انہیں کی پیروی میں' ڈیڑھ سو سال بعد........ دو نہتے اور مجبور انسانوں نے........ فسطائی ہتھکنڈوں سے سر ٹکرا کر........ انسانیت کی لاج رکھ لی........ انسانیت زندہ باد........! انسان دشمنی........ ؟؟؟؟

☆☆☆

1761

آپ کے افسانے پڑھنے کا اتفاق پہلی بار ہوا۔آپ نے تو کہانی کا رنگ روپ ہی بدل دیا ہے۔صرف رنگ روپ ہی نہیں بلکہ لب ولہجہ بھی۔اس کا ایک قابل تعریف پہلو یہ ہے کہ کہانی سے کہانی پن کو خارج نہیں ہونے دیا۔علامتی افسانے کو رواج دینے والوں کے ہاتھ سے کہانی پن نکل گیا تھا اور یہ ہی سبب ہے کہ علامتی افسانہ نامقبول ہوتا چلا گیا اور کہانی پن سے لبریز کہانی پھر قرطاسِ ادب پر نمودار ہونا شروع ہوگئی۔اس روِش میں دو مستثنیات نظر آئیں۔ایک ابوالفضل صدیقی اور ایک انتظار حسین............لیکن آپ کی افسانہ نگاری کا رنگ ہی نرالا ہے۔انسان کی نفسیاتی کشمکش کو جس طرح آپ نے اپنی گرفت میں لیا ہے یہ کم افسانہ نگاروں کے حصے میں آئی ہے۔آپ ادارتی ذمہ داریوں کے ساتھ افسانہ نگاری کے فن کو بھی کامیابی کے ساتھ سنوار، نکھار رہے ہیں۔مبارک باد

جگن ناتھ آزاد

(پروفیسر آف ایمریٹس)

گورنمنٹ کوارٹر

جموں، بھارت